علاّمہ اقبال سے آخری ملاقاتیں

صوفی تبسّم

علامہ اقبالؒ سے آخری ملاقاتیں

علّامہ اقبالؒ سے آخری ملاقاتیں

کچھ یادیں

مصنّفہ

صُوفی غلام مصطفےٰ تبسّم مرحوم

مرتب : صُوفی گلزار احمد

ماورا پبلشرز۔ ۳ بہاولپور روڈ۔ لاہور

باذوق لوگوں کے لیے

ھماری کتابیں

خوبصورت کتابیں

تزئین و اہتمامِ اشاعت

خالد شریف

ضابطہ

مرتّب : پروفیسر صوفی گلزار احمد

ناشر : خالد شریف

مطبع : فضل حق پرنٹرز، لاہور

اشاعت : ۱۹۸۹ء

فکرِ اقبالؒ

کے نام

فہرست مضامین

پیش لفظ ، ۹

عرضِ مرتب ، ۱۳

صوفی تبسّم مرحوم کے مختصر حالاتِ زندگی ـــــ صوفی گلزار احمد ، ۱۵

صوفی تبسّم کی تصانیف ـــــ ـــــ صوفی گلزار احمد ، ۱۹

علامہ اقبال اور صوفی تبسّم ، ۲۳

باسمہٖ تعالیٰ ـــــ صوفی غلام مصطفےٰ تبسّم ، ۳۳

علامہ اقبال اور خواجہ احمد دین امرتسری ، ۴۹

علامہ اقبال اور مولانا محمد حسین عرشی امرتسری ، ۵۷

علامہ اقبال اور حکیم فیروز الدین طُغرائی ، ۶۵

ڈاکٹر سخاء اللہ پسر خواجہ احمد دین امرتسری اور علامہ اقبال ، ۷۳

علامہ اقبال کے بارے میں ایک تذکرہ ، ۷۷

علامہ اقبال کے ساتھ چند اہم ملاقاتیں ، ۸۱

علامہ اقبال سے آخری ملاقاتیں ، ۹۳

منظوم خراجِ عقیدت ، ۱۰۱

فارسی ۔ اردو ۔ پنجابی

اقبال کے منظوم تراجم ، ۱۱۳

پیش لفظ

آج کل پیش لفظ لکھنا ایک رسمی سی بات رہ گئی ہے۔ رسموں کے اُدھیڑبن میں ہی ہماری ساری زندگی بیت جاتی ہے۔ ہم سب طوعاً و کرہاً رسموں میں اسیر ہیں۔ ہم ہر بات کو اپنی پسند و ناپسند کے ترازو میں تولنے کے عادی ہیں لیکن جہاں تک صوفی غلام مصطفےٰ تبسّم کا تعلق ہے وہ ایک درویش منش، سچے اور کھرے انسان تھے۔ انہوں نے کبھی اپنی ذات کو جھوٹ کے طلسم سے فریب دیا اور نہ ہی دوسروں کی آنکھوں میں دُھول جھونکنے کی کوشش کی۔

زیرِ نظر کتاب ایک تاریخی، سماجی اور ثقافتی دستاویز ہے جس کے ہر فقرے اور ہر لفظ میں موصوف کی بے قرار روح کی تڑپ اور دھڑکتے ہوئے دل کی صدا سنائی دیتی ہے۔ یہ عارضی و فانی زندگی ناکامیوں اور کامیابیوں سے عبارت ہے۔ بعض اوقات ایسی تاریخ ساز ہستیاں اس زندگی کے سنگھاسن پر براجمان ہوتی ہیں جو ان کامیابیوں اور تشنہ کامیوں سے قطع نظر تاریخ میں ایسے چراغ روشن کر جاتی ہیں جن کی ضیا پاشیوں کے ذریعے آنے والی نسلیں اپنی راہیں تلاش کرتی رہتی ہیں۔ صوفی تبسّم بھی ایک ایسی ہی تاریخ ساز شخصیت تھے جنہوں نے اپنی ملّی تاریخ کو نئی جہت، نیا رُخ دینے کی تگ و دو کی۔ آج ہم بجا طور پر اُن پر فخر کر سکتے ہیں۔ اگر ہم صوفی صاحب کے ذہنی سفر کی منزل کا تعیّن کرنا چاہیں تو وہ اقبال فہمی پر ختم ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ علامہ اقبال کی طرح احساساتِ ملّی کو بیدار کر کے قوم کو ایک نیا شعور اور ایک نیا وجدان دینا چاہتے تھے۔ پروفیسر صوفی گلزار صاحب

کی یہ کاوش قابلِ تحسین ہے کہ انہوں نے نہ صرف ان بکھرے ہوئے اوراق اور بھولی بسری یادوں کو اکٹھا کیا بلکہ اپنے والد محترم کے علم و ادب کے دیگر جواہر پاروں کو بھی بڑے ذوق و شوق سے مرتب کر کے اس شعر کو عملی جامہ پہنایا ہے۔ ؎

نامِ نیک رفتگاں ضائع مکُن
تا بماند نامِ نیکت برقرار

زیرِ نظر مجموعے کے متعلق جناب ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب ملفوظاتِ اقبال مطبوعہ جون ۱۹۷۷ء کے پیش گفتار میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"..... بعض مجموعے زیرِ ترتیب ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کے ملفوظات اقبال کی صحبت میں اور جناب صوفی تبسّم کی یادداشتیں۔ امید ہے کہ یہ ملفوظات حواشی اور تعلیقات کے ساتھ شائع ہوں گے۔"

اس تحریر کے چھ سات ماہ بعد ہی صوفی تبسّم ان یادداشتوں کو تشنۂ تکمیل چھوڑ کر اس سرائے فانی سے عالمِ جاوداں کو سدھار گئے۔

اس طرح آج گیارہ سال سے زائد عرصہ گزرنے کے بعد یہ یادداشتیں عقیدت مندانِ اقبال کی خدمت میں پیش ہو رہی ہیں۔ اس موقعہ پر حضرت علیؓ کا ایک زریں مقولہ خواہ مخواہ نوکِ قلم پر چڑھ آیا ہے۔ دراصل وہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کی ایک انوکھی اور بے نظیر فلاسفی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

عَرَفْتُ رَبِّیْ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ

یعنی میں نے اپنے رب کو ارادوں کے پورا نہ ہونے کی وجہ سے پہچانا۔ اگر صوفی گلزار صاحب ان یادداشتوں کو مکمل کرنے کا بیڑا نہ اٹھاتے تو نہ صرف یہ یادداشتیں اقبالیات میں معمّا بنی رہتی بلکہ حیاتِ اقبال کے بعض اہم گوشے بھی پنہاں رہ جاتے۔ صوفی صاحب نے ان میں ایسا اچھوتا اور شائستہ طرزِ بیان اختیار کیا ہے کہ تاریخ کے

وہ گوشے بھی نمایاں ہو گئے ہیں جو ہماری ملی دستاویزات کا حصہ ہیں۔ پھر صوفی تبسم کا شمار بھی اقبال کے ثقہ راویوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے ان یادداشتوں میں کچھ آپ بیتی اور کچھ اقبال بیتی ایسے دل کش انداز میں بیان کی ہے کہ ان کو پڑھنے سے ھَلْ مِنْ مَّزِیْدٍ کی ہوک دل میں اٹھنے لگتی ہے کہ کاش وہ اپنی حیاتِ مستعار میں ان کو مکمل کر پاتے۔ بہرحال ان کے خلف الرشید مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے حتی الامکان مشتاقانِ اقبال کو یہ تشنگی محسوس ہونے نہیں دی۔ جَزَاکَ اللّٰہُ اَحْسَنَ الْجَزَاء ۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْم۔

شاہ کوٹ، ۲۰ فروری ۸۹ء — محمد عیص عابد

عرضِ مرتب

صوفی تبسم مرحوم علامہ اقبال کے بہت بڑے معتقد اور مداح تھے۔ آپ تمام عمر بحیثیت ادیب اور شارح علامہ اقبال کے افکار و نظریات کی ترجمانی کرتے رہے۔ آپ کی تقاریر اور مضامین کا یہ سلسلہ قریباً نصف صدی پر محیط ہے۔ آپ نے علامہ اقبال کی شاعری، فلسفے اور فکر و فن پر بہت کچھ لکھا اور زندگی کے آخری لمحات تک علامہ اقبال کے خیالات و نظریات کی تشہیر کرتے رہے اور اس طرح امتِ مسلمہ کو علامہ اقبال کے افکار و خیالات سے روشناس کرانے کے کثیر مواقع فراہم کرتے رہے۔ یہ دراصل صوفی صاحب کی زندگی کا قلمی جہاد تھا۔

آپ نے علامہ اقبال کے صد سالہ جشنِ ولادت کے سلسلے میں بھی ایک فعال کارکن کی حیثیت سے کام کیا اور گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ آپ اس وقت اقبال اکادمی پاکستان کے وائس پریذیڈنٹ کے عہدے پر فائز تھے۔ زیرِ نظر کتاب صوفی صاحب کی آخری تصنیف ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ صوفی صاحب کو زندگی نے اتنی مہلت نہ دی کہ وہ علامہ اقبال پر یہ کتاب اپنی زندگی میں مکمل کر پاتے۔ اس کتاب کے چند صفحات لکھنے پائے تھے کہ آپ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ میں نے اس وقت یہ صفحات محفوظ کر لئے تاکہ آئندہ اس کتاب کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا جاتے۔ اسی اثنا میں مجھے مولانا محمد حسین عرشی مرحوم جو علامہ اقبال کے ہم عصر اور صوفی صاحب کے قریبی ساتھی تھے، ان سے ملنے کے مواقع ملتے رہے۔ انہوں نے یہ مختصر مسودہ دیکھا اور مجھے یہ مشورہ دیا کہ میں اس کتاب کو

مکمل کر دوں میں مرحوم کا نہایت مشکور ہوں ۔ اللہ تعالےٰ انہیں اس نیک کام کی جزا دے کہ انہوں نے اس کتاب کے بارے میں جگہ جگہ مفید مشورے دیے اور مختلف تجاویز پیش کیں جو کتاب مکمل کرنے کے سلسلے میں میرے لیے رہنما ثابت ہوئیں ۔ یہ دراصل اُن کی بابرکت ذات تھی جس نے مجھے اس کتاب کو مکمل کرنے کا حوصلہ دیا اور ہمت بندھائی ۔

اس کتاب کی تکمیل کے سلسلے میں مَیں اپنے دیرینہ دوست ڈاکٹر محمد عیص عابد صاحب کا بھی بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے تمام مسودے کو بڑی توجہ اور انہماک سے دیکھا اور جگہ جگہ اس میں ترمیم اور اضافہ کیا ۔ یہ ان کی وسیع النظری کا بیّن ثبوت ہے نیز اُنہوں نے اس کتاب کے لئے پیش لفظ بھی عنایت فرمایا ۔ اُن کی یہ عنایت دراصل اُس محبّت اور لگن کا اظہار ہے جو وہ والد بزرگوار صوفی تبسّم سے رکھتے تھے ۔

مجھے افسوس ہے کہ یہ کتاب نہایت تاخیر سے شائع ہو رہی ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گردشِ دوراں نے مہلت نہ دی کہ میں جلد اس کتاب کو قارئین کے سامنے پیش کر سکوں ۔ چنانچہ اب اس کتاب کو ماورا پبلشرز کی وساطت سے پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں ۔

اس کتاب کو مرتب کر کے میں اپنے آپ کو مطمئن محسوس کرتا ہوں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے وہ فریضہ کر دیا ہے جس کی ادائیگی مجھ پر واجب اور ضروری تھی ۔

مجھے امید ہے کہ یہ کتاب اقبالیات کے قدر دانوں اور شائقین کے لئے بہت مفید ثابت ہو گی اور وہ محقق حضرات بھی اس کتاب سے خاطر خواہ استفادہ کر سکیں گے جو آئندہ سالوں میں علامہ اقبال کی شخصیت، حیات اور فن پر تحقیق کرنے کے خواہش مند ہوں گے ۔ اللہ تعالےٰ میری اس کوشش کو بار آور کرے ۔

مرتب :

پروفیسر صوفی گلزار احمد

مورخہ ۲۶ فروری ۱۹۸۹ء

صُوفی تبسّم مرحوم

مختصر حالاتِ زندگی

صوفی تبسم مرحوم پاکستان کے مشہور و معروف معلّم، شاعر، ادیب اور نقاد گزرے ہیں۔ آپ کا پورا نام صوفی غلام مصطفےٰ ہے، تبسم تخلص ہے اور عام طور پر صوفی تبسم کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ امرتسر میں ۴ اگست ۱۸۹۹ء کو پیدا ہوئے جہاں آپ کے بزرگ کشمیر سے آکر آباد ہو گئے تھے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم چرچ مشن سکول امرتسر میں حاصل کی۔ ایف اے خالصہ کالج امرتسر سے کیا۔ اس کے بعد ایف سی کالج لاہور سے بی۔ اے کیا۔ آپ نے اسلامیہ کالج لاہور سے فارسی کی سند حاصل کی۔ ایم۔ اے فارسی کرنے کے بعد سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے بی۔ ٹی کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد گورنمنٹ ہائی سکول امرتسر میں بطور استاد مقرر ہوئے۔ کچھ عرصے تک تدریسی فرائض سرانجام دینے کے بعد انسپکٹر آف سکولز ہو گئے۔ اس کے بعد سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں السنہ شرقیہ کے پروفیسر ہوئے۔ تین چار سال یہاں کام کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں چلے آئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں صدر شعبہ فارسی اور صدر شعبہ اردو رہے۔ اور مدت ملازمت اسی کالج میں گزار کر یہیں سے ریٹائر ہوئے۔ آپ کے شاگرد ہزاروں کی تعداد میں پاکستان کے گوشے گوشے میں موجود ہیں۔

۴ اگست ۱۹۵۴ء کو گورنمنٹ کالج لاہور سے ریٹائر ہوئے لیکن ریٹائر ہونے کے بعد بھی آپ درحقیقت ریٹائر نہ ہوئے بلکہ آپ بدستور علمی، ادبی کاموں میں مصروف

رہے۔ ۱۹۵۷ء میں آپ کو خانہ فرہنگِ ایران کا ڈائرکٹر بنا دیا گیا۔ اس جگہ آپ چار پانچ سال تک کام کرتے رہے۔ خانہ فرہنگِ ایران کو صحیح خطوط پر چلانے اور لوگوں میں فارسی کا ذوق و شوق پیدا کرنے میں آپ کی کوششیں قابلِ داد ہیں۔ آپ کچھ عرصہ تک "لیل و نہار" کے ایڈیٹر بھی رہے۔ آپ کی سرپرستی میں اس علمی ادبی مجلّے نے کافی ترقی کی اور اس کا شمار اعلیٰ معیاری رسالوں میں ہونے لگا۔ "لیل و نہار" میں کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد اس کی ادارت کو خیرباد کہا اور ریڈیو پاکستان لاہور سے وابستہ ہو گئے۔ ریڈیو پاکستان لاہور میں آپ بطور ایک مشیر نہایت تندہی اور مستعدی سے کام سرانجام دیتے رہے۔ آپ نے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں جنگی ترانے لکھ کر قومی خدمت کا ایک اہم فریضہ سرانجام دیا۔ آپ پاکستان آرٹ کونسل میں بطور چیئرمین اور پاکستان اقبال اکیڈمی میں بطور وائس چیئرمین کام کرتے رہے۔ اس کے علاوہ بہت سے علمی ادبی مجلّوں کے اعزازی مدیر بھی رہے۔ پاکستان کی طرف سے جب مختلف ثقافتی مشن ایران اور روس کے دورے پر گئے تو اس میں آپ نے بھی شرکت کی۔

صدر ایّوب کے دور میں آپ کو علمی ادبی خدمت کے سلسلے میں تمغۂ خدمت سے نوازا گیا، اس کے علاوہ پانچ ہزار روپیہ نقد انعام ملا۔ صدر جنرل محمد یحییٰ خاں کے دور میں آپ کو ستارۂ امتیاز سے نوازا گیا۔ شہنشاہ ایران نے آپ کو فارسی زبان و ادب کی خدمت کے صلے میں تمغۂ فضیلت انعام میں دیا۔

صوفی تبسّم فارسی، اُردو اور پنجابی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ آپ کو زبان و بیان پر بہت قدرت حاصل تھی۔ اُردو کے علاوہ آپ فارسی کے قادرالکلام شاعر تھے۔ پنجابی میں بھی بے ساختہ شعر کہتے تھے اور پنجابی شعرا انہیں استاد مانتے تھے۔

صوفی تبسّم مرحوم بچوں کے پسندیدہ شاعر تھے۔ بچّوں کے لیے انہوں نے ایسی نظمیں لکھیں جو زبان زدِ عام ہیں۔ ان نظموں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں موسیقیت رچی بسی ہے۔ بچے ان نظموں کو نہایت آسانی سے ازبر کر لیتے ہیں اور گاتے پھرتے ہیں۔ بچّوں کی شاعری

درحقیقت ان کی اس گہری محبت وشفقت کا اظہار تھی جو وہ بچوں سے رکھتے تھے۔ نظموں کا ایک مجموعہ "جھولنے" شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ نظموں کا ایک مجموعہ "ٹوٹ بٹوٹ" فیروز سنز کا طبع شدہ ہے۔ صوفی صاحب کے پہلے مجموعہ کلام "انجمن" کا فیروز سنز نے دوسرا ایڈیشن پیش کیا ہے۔ انجمن کے علاوہ غزلیات کا ایک مجموعہ "دامنِ دل" مکتبہ عالیہ کا طبع شدہ ہے۔ پنجابی کلام کا مجموعہ "نظراں کردیاں گلاں" پنجابی ادبی بورڈ لاہور نے شائع کیا ہے۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد نے "سرشکِ تبسم" کے نام سے اردو کلام کا ایک مجموعہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ یہ تمام کتابیں راقم الحروف کی مرتب کردہ ہیں۔

امیر خسرو کے فارسی کلام کا منظوم اُردو ترجمہ دوگونہ کے نام سے نیشنل بُک فاؤنڈیشن آف پاکستان نے شائع کیا ہے۔ بچّوں کی نظموں کا ایک مجموعہ "ٹول مٹول" کے نام سے شیخ غلام علی اینڈ سنز کا طبع شدہ ہے۔

مندرجہ بالا کتب کے علاوہ "مسلمانوں کا علمِ جغرافیہ اور شوقِ سیاحت"۔ ایک اُردو ڈرامہ "جاہ وجلال"۔ دو ناٹک (پنجابی ڈرامے)، صد شعرِ اقبال، حکمتِ قرآن، شرح دیوانِ غالب (فارسی)، (دو جلدوں میں)، روحِ غالب۔ سراپردۂ افلاک۔ نقشِ اقبال۔ اقبال لاہوری، بچّے اور اقبال، یک ہزار و یک سخن وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ زندگی کے آخری لمحات تک وہ علامہ اقبال کے افکار و نظریات کو بحیثیت استاد اور شارح نوجوان نسلوں کے ذہنوں میں منتقل کرتے رہے۔

صوفی تبسّم مرحوم نے کافی غیر مطبوعہ علمی ادبی سرمایہ چھوڑا ہے جس کی اشاعت کا بیڑا میں نے اٹھا رکھا ہے۔ کچھ کتابیں اشاعت کے بعد قارئین کی نظر کر چکا ہوں اور آئندہ بھی کرتا رہوں گا۔

صوفی تبسّم نے ۷ فروری ۱۹۷۸ء کو وفات پائی۔ اس وقت آپ کی عمر ۷۹ برس کے قریب تھی۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔ آمین

مرتب: پروفیسر صوفی گلزار احمد

صُوفی تبسّم کی تصانیف

۱۔ انجمن (مجموعہ کلام)، فارسی۔ اُردو۔ پنجابی
مطبوعہ فیروز سنز لمیٹڈ۔ لاہور (دوسرا ایڈیشن)،

۲۔ دامنِ دل (مجموعہ غزلیات)، مطبوعہ مکتبہ عالیہ لاہور (بار اوّل)،
مرتب : صوفی گلزار احمد

۳۔ سرشکِ تبسّم (مجموعہ نظم، گیت، قومی ترانے)
مطبوعہ نیشنل بک فاؤنڈیشن۔ اسلام آباد مرتب: صوفی گلزار احمد

۴۔ نظراں کردیاں گلاں (پنجابی کلام)، مطبوعہ پنجابی ادبی بورڈ۔ لاہور
مرتب : صوفی گلزار احمد

۵۔ انتخاب کلامِ اقبال مطبوعہ اقبال اکادمی پاکستان۔ طبع اوّل ۱۹۷۷ء

۶۔ انتخاب کلامِ امیر خسرو (طوطیِ شکر مقال)، (عکسی)،
مطبوعہ پیکیجز لمیٹڈ۔ لاہور طبع اوّل

۷۔ اقبال اور بچے مطبوعہ پیکیجز لمیٹڈ لاہور طبع اوّل

۸۔ یک ہزار و یک سخن مطبوعہ پیکیجز لمیٹڈ لاہور طبع اوّل

۹۔ شرح غزلیاتِ غالب (فارسی)، جلد اوّل اور دوم
مطبوعہ پیکیجز لمیٹڈ لاہور طبع اوّل

۱۰۔ تیرو نشتر (اقبال کے اردو اشعار)، انتخاب صوفی تبسّم مرحوم

۱۱۔ تیرونشتر (اقبال کے فارسی اشعار)۔ انتخاب صوفی تبسّم مرحوم
۱۲۔ پنجاب کی شاعری پر فارسی روایات کا اثر
مطبوعہ محکمۂ تعلقاتِ عامہ حکومت پنجاب لاہور
۱۳۔ حرف وصوت ۔ اردو/فارسی ۔ انتخاب کلامِ اقبال
حصّہ فارسی (صوفی تبسّم)۔ حصّہ اردو (احمد ندیم قاسمی)
شائع کردہ: نیشنل کمیٹی برائے تقریبات صدسالہ جشن ولادتِ اقبال ۱۹۷۷ء
طبع اوّل
۱۴۔ شرح صد شعرِ اقبال۔ (جلد اوّل اردو) مطبوعہ اُردو سائنس بورڈ۔ لاہور
طبع اوّل ۱۹۷۷ء
۱۵۔ سرا پردۂ افلاک۔ مطبوعہ اقبال اکادمی پاکستان لاہور۔ طبع اوّل ۱۹۷۷ء
۱۶۔ نقشِ اقبال ۔ (علامہ اقبال کے فارسی کلام کا پنجابی ترجمہ)
مطبوعہ اقبال اکادمی پاکستان۔ لاہور
۱۷۔ علامہ اقبال ۔ از آقای مجتبیٰ مینوی ۔ مترجم صوفی تبسّم
مطبوعہ بزمِ اقبال (بار دوم)
۱۸۔ شعر فارسی معاصر (فارسی، اُردو) مرتبہ: صوفی تبسّم۔ محمد حسین عرشی
شائع کردہ: گلوب پبلشنگ کمپنی۔ اندرون لوہاری دروازہ۔ لاہور
۱۹۔ رُوحِ غالب ۔ مطبوعہ گلوب پبلشرز۔ اُردو بازار لاہور۔ طبع دوم
۲۰۔ زندہ نغمے۔ مرتبہ صوفی تبسم۔ میر نسیم محمود۔ ناصر کاظمی
مطبوعہ حامد محمود اینڈ کمپنی لاہور۔ طبع اوّل
۲۱۔ دو ناٹک (ساون رین دا سُفنا۔ خطرناک لوک)
زیرِ طبع: سنگِ میل پبلشرز لاہور ۔ طبع دوم

۲۲۔ جاہ وجلال ۔ ایک ڈرامہ (اُردو)۔زیرِ طبع سنگِ میل پبلشرز ۔ طبع دوم

۲۳۔ حکمتِ قرآن ۔ زیرِ طبع سنگِ میل پبلشرز لاہور ۔ طبع دوم

۲۴۔ مسلمانوں کا علمِ جغرافیہ اور شوقِ سیاحت

زیرِ طبع : سنگِ میل پبلشرز لاہور ۔طبع دوم

۲۵۔ کلیاتِ طغرائی ۔ مرتبہ صوفی تبسم ۔مطبوعہ مسلم پریس لاہور ۔طبع اوّل

۲۶۔ دوگونہ (امیر خسرو کی سو غزلوں کا اُردو غزل میں ترجمہ)

مطبوعہ نیشنل بک فاؤنڈیشن ۔اسلام آباد ۔ طبع اوّل

۲۷۔ جھولنے (بچوں کی نظمیں)، فیروز سنز لمیٹڈ لاہور ۔طبع دوم (انعام یافتہ)

۲۸۔ ٹوٹ بٹوٹ (بچوں کی نظمیں)، فیروز سنز لمیٹڈ لاہور ۔طبع دوم (انعام یافتہ)

۲۹۔ ٹول مٹول (بچوں کی نظمیں)، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۔ طبع اوّل

۳۰۔ صد شعرِ اقبال (فارسی)، ۔زیرِ طبع ۔ مرتب : صوفی گلزار احمد

۳۱۔ علامہ اقبال صوفی تبسم کی نظر میں ۔ مصنفہ صوفی تبسم مرحوم

مطبوعہ اقبال اکادمی پاکستان۔لاہور ۔مرتب : ڈاکٹر نثار قریشی

علّامہ اقبال اور صُوفی تبسّم

صُوفی تبسّم کا اُس وقت بچپن کا زمانہ تھا جب علّامہ اقبال شعر و سخن کی بلندیوں کو چھُو رہے تھے، چنانچہ طالب علمی کے زمانے ہی سے صُوفی صاحب کو علّامہ اقبال سے عقیدت ہوگئی تھی۔ صُوفی صاحب کی عُمر اُس وقت بارہ برس کی تھی جب انہوں نے پہلے پہل علّامہ اقبال کا نام اپنے اُستاد قاضی حفیظ اللہ سے سُنا اور ۱۹۱۱ء میں پہلی مرتبہ لاہور میں انجمن حمایتِ اسلام کے جلسے میں علّامہ اقبال کو دیکھنے کا اتفاق ہُوا۔ اس کا ذِکر صُوفی صاحب مرحوم نے اپنے ایک انٹرویو میں کیا[1] ہے۔

"سب سے پہلے مَیں نے اُنہیں ۱۹۱۱ء میں حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں شعر پڑھتے سُنا۔ میرے والد مرحوم کو اس طرح کی محفلوں میں جانے کا بہت شوق ہوتا تھا، وہ ہر سال میلہ چراغاں کے موقع پر احباب کے ساتھ لاہور آجاتے تھے۔"

صُوفی صاحب نے دوسری بار علّامہ اقبال کو ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں دیکھا جب وہ جلیانوالہ باغ کے سانحہ سے متعلق مُسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کے لئے آئے تھے، وہاں انہوں نے حکیم محمد اجمل خاں کی صدارت میں مندرجہ ذیل اشعار پڑھے۔

---

[1] اقبال کے شب و روز — انٹرویو صوفی تبسّم ریڈیو پاکستان لاہور
میزبان ناصر قریشی

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زنداں صدف سے ارجمند
مشک از فر چیز کیا ہے اِک لُہو کی بوند ہے
مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر
کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند
"شہپر زاغ و زغن در بند قید و صید نیست
ایں سعادت قسمت شہباز و شاہین کردہ اند"

تیسری بار ۱۹۲۰ء میں اپنے اُستاد حکیم فیروز الدین طغرائی صاحب کے ساتھ امرتسر سے لاہور آئے اور علامہ کی محفل میں شریک ہوئے، اس محفل میں شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی اور چند دوسرے احباب شریک تھے، صوفی صاحب مرحوم خوش گپیوں، پھبتیوں اور شعر و سخن کی اس محفل کا محض نظارہ کرتے رہے اس زمانے میں وہ خالصہ کالج امرتسر کے طالب علم تھے اور علامہ اقبال سے باقاعدہ متعارف نہ ہوئے تھے۔

صوفی صاحب اس کے بعد بھی اکثر انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں علامہ اقبال کے نیاز حاصل کرتے رہے، ۱۹۲۱ء میں انہوں نے ایف سی کالج لاہور میں داخلہ لیا اور نیازمندی کا یہ سلسلہ آگے بڑھا، ۱۹۲۳ء میں علامہ اقبال سے باقاعدہ ملاقات حافظ محمود شیرانی کے توسط سے ہوئی۔ اس ملاقات[1] کا تذکرہ بھی انہوں نے اپنے انٹرویو میں کیا ہے۔

"۲۳-۱۹۲۲ء کا واقعہ ہے کہ میرے مرحوم اُستاد حافظ محمود شیرانی مجھے اُن (علامہ اقبال) کے پاس لے گئے، اس وقت وہ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں رہتے تھے، انہوں نے اس طرح

---

[1] اقبال کے شب و روز — انٹرویو صوفی تبسم ریڈیو پاکستان لاہور
میزبان ناصر قریشی

میرا تعارف کرایا کہ یہ میرا طالب علم ہے اور وہاں سے پھر ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہُوا۔ اس سلسلے کے بڑھنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میرے جو ہم جماعت اور دوست تھے اُن میں ایک ڈاکٹر تاثیر تھے، ہم ایک دُوسرے سے پہلے آشنا تھے، جب مَیں لاہور میں آیا تھا تو غائبانہ تعارف تھا، کیونکہ ہم ایک دوسرے کے مضامین اور نظمیں پڑھتے تھے، پھر ہم مل کر ان (علاّمہ اقبال) کے ہاں جایا کرتے تھے۔"

یہ تو معلوم نہیں کہ صوفی صاحب کی علاّمہ اقبال سے خط و کتابت کب شروع ہوئی اور کب تک رہی، البتہ ستمبر ۱۹۲۵ء کے دو خط ہمارے سامنے ہیں اور ان خطوط کا ذکر صوفی صاحب نے اس کتاب میں بھی کیا ہے، یہ وہ زمانہ تھا جب صوفی صاحب کا علاّمہ اقبال سے باقاعدہ تعارف ہو چکا تھا، خود لکھتے ہیں۔

"اگرچہ مَیں فارغ التحصیل ہو کر لاہور سے اپنے وطن چلا گیا تھا تاہم اُن سے مُلاقات کا اشتیاق ہمیشہ دامن گیر رہتا اور مَیں گاہے گاہے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا اور اُن کی عالمانہ گفتگو سے استفادہ کرتا رہتا۔ ع۱

خطوط کا سلسلہ اس طرح شروع ہُوا کہ خواجہ احمد دین امرتسر کے مشہور عالم دین تھے اس زمانے میں امرتسر سے ایک دینی رسالہ "بلاغ" کے نام سے شائع ہونا شروع ہُوا جس کا بعد میں "البیان" نام پڑ گیا، خواجہ صاحب کے مضامین اور قرآن حکیم کی تفسیر اس میں شائع ہوتی تھی، علاّمہ اقبال اس رسالے کا باقاعدہ مطالعہ کرتے اور اس رسالے کے مضامین میں گہری دلچسپی لیتے تھے، چنانچہ علاّمہ اقبال خواجہ احمد دین امرتسری سے ملاقات کے متمنّی تھے، صوفی صاحب رقمطراز ہیں!

"میری دلی خواہش تھی کہ ڈاکٹر صاحب اور خواجہ صاحب کی ملاقات ہو اور

ع۱ راوی۔ مئی۔جون ۱۹۳۸ء اقبال نمبر ص ۱۳۳ بعد ازاں یہ تحریر "بلاغ" امرتسر اگست ۱۹۳۸ء اور پھر "اقبال ریویو" جولائی ۱۹۷۴ء میں شائع ہوئی۔

دونوں بزرگوں نے خود بھی بارہا اس کے لئے انتہائی اشتیاق کا اظہار فرمایا لیکن یہ چیز ہمیشہ معرضِ التوا میں پڑی رہی، آخر کار ایک موقع آیا۔" ع۱

خواجہ صاحب سے مُلاقات کا اشتیاق علامہ اقبال کے دونوں خطوط سے ظاہر ہوتا ہے جو انہوں نے ستمبر ۱۹۲۵ء میں یکے بعد دیگرے لکھے، ۲ ستمبر ۱۹۲۵ء کے خط میں لکھتے ہیں۔

"..... مولوی صاحب موصوف کو میرے ساتھ تبادلۂ خیالات کرنے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا، ہاں مجھ کو ان سے فائدہ پہنچنا یقینی ہے، اس واسطے وہ اگر مجھ کو مستفیض کرنے کے ارادہ سے امرتسر سے لاہور آنے کی زحمت گوارا فرمائیں تو اُن کی بہت مہربانی ہے جس کے لئے میں اُن کا نہایت شکر گزار ہُوں، مجھ کو ان کے خیالات سے کسی حد تک پہلے بھی آگہی ہے، کیا اچھّا ہو کہ وُہ شریعت محمدؐیہ پر ایک مبسوط کتاب تحریر فرمائیں جس میں عبادت و معاملات کے متعلق صرف قرآن سے استدلال کیا گیا ہو، معاملات کے متعلق خاص طور پر اس قسم کی کتاب کی آج کل شدید ضرورت ہے۔"

مولوی صاحب نے علامہ اقبال سے ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا تھا اور اس سلسلے میں انہوں نے لاہور آنے کا اِرادہ بھی کیا، صُوفی صاحب لکھتے ہیں!

"اس ضمن میں سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ تھی کہ مُلاقات سے پہلے دونوں بزرگوں نے زبانی اور تحریری طور پر نہایت عجز اور انکسار سے کام لیا، جیسا کہ اس خط کے اندازِ بیان سے ظاہر ہے، ہر ایک اس بات پر زور دیتا کہ مُلاقات کا مقصد محض دوسرے سے استفادہ کرنا ہے اور بس۔" ع۲

ع۱ راوی۔ مئی۔ جون ۱۹۳۸ء اقبال نمبر ص ۱۳۳ بعد ازاں یہ تحریر "بلاغ" امرتسر اگست ۱۹۳۸ء اور پھر "اقبال ریویو" جولائی ۱۹۷۴ء میں شائع ہوئی۔

ع۲ راوی مئی۔ جون ۱۹۳۸ء ص ۱۳۳

۶ ستمبر ۱۹۲۵ء کو علامہ اقبال نے صوفی صاحب کو دوسرا خط لکھا، اس میں استفادے کی خواہش کا پھر اظہار کیا۔

صوفی صاحب نے ان دونوں خطوط کا ذکر اپنی اس کتاب میں کیا ہے، صوفی صاحب کے علاوہ جن حضرات کے علامہ اقبال سے تعلقات استوار تھے اُن کی فہرست تو بہت طویل ہے البتہ اُن میں یہ حضرات خاص طور پہ نمایاں ہیں، سید نذیر نیازی، ڈاکٹر تاثیر، رشید طارق، بدر الدین بدر، عبدالرحمٰن چغتائی، پطرس بخاری، عبدالمجید سالک، مولانا محمد حسین عرشی، خضر تمیمی، حفیظ ہوشیار پوری، سید الطاف حسین، سراج نظامی وغیرہ

صوفی صاحب کے علامہ سے تعلقات شوخی کی حد تک پہنچے ہوتے تھے، ڈاکٹر تاثیر بیان کرتے ہیں "صوفی تبسم ان چند دست دراز لوگوں میں سے تھے جو ڈاکٹر صاحب کے حقے پر ہاتھ ڈال دیا کرتے تھے"[1] ایک دفعہ "بال جبریل" ابھی پریس میں تھی تو پطرس بخاری اس کے پروف لے آئے تھے، انہوں نے صوفی تبسم سے کہا کہ "چند بہترین طالب علموں کو جمع کرو ہم شعر پڑھیں گے، میں پروف لایا ہوں" صوفی صاحب کا بیان ہے کہ ایک گھنٹہ انہوں نے شعر پڑھ کر سنائے تو اسی شام ہم علامہ کے ہاں پہنچ گئے "ہم نے کہا جی وہ شعر"... کہنے لگے "آپ کو اس کا کیسے پتا چلا، تو ہم نے کہا "جی آپ کو الہام ہوتا ہے تو ہمیں ان شعروں کا القا ہو جاتا ہے۔ عقیدت کی وجہ سے"[2]

صوفی صاحب اکثر علامہ اقبال کی محفلوں میں شریک ہوتے رہے، ان کے ساتھ جو احباب اور شاگرد ہُوا کرتے تھے، اُن میں خواجہ صاحب اور عرشی صاحب کے علاوہ ڈاکٹر تاثیر سراج نظامی، عبدالرشید طارق، حفیظ ہوشیار پوری، سید الطاف حسین اور خضر تمیمی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

---

[1] اقبال کا فکر و فن از ڈاکٹر تاثیر مرتبہ افضل حق قریشی ص ۱۲۶

[2] ریڈیو انٹرویو

ایک مُلاقات میں صوفی صاحب نے بابو کرم (جو پنجابی کے مشہور شاعر گزرے ہیں) کا تعارف کرایا، بابو کرم نے اپنی چند پنجابی کی نظمیں سنائیں جو ڈاکٹر صاحب نے پسند فرمائیں، عبدالرشید طارق نے اس کا تذکرہ کیا ہے، صُوفی صاحب کے ساتھ ان محفلوں کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

ایک روز جب کہ مَیں، صوفی غلام مصطفےٰ تبسّم اور بدرالدین بدر اور پنجابی کے مشہور شاعر بابو کرم اور سراج صاحب اور ایک اور دوست ان کے پاس بیٹھے تھے تو کانگریس اور مسلم لیگ کا تذکرہ چھڑا [1]

صوفی صاحب علاّمہ کے حُقّے پر ہاتھ ڈال دیا کرتے تھے، یہ بات ڈاکٹر تاثیر نے تو بیان کی ہے، خضر تمیمی نے بھی اس کا ذکر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں!

"ہم میں سے ممدوح کے ساتھ حقّہ پینے کا شرف صرف صوفی صاحب قبلہ کو حاصل ہوا [2]

حفیظ ہوشیار پُوری لکھتے ہیں۔

"اس کے بعد دو تین مرتبہ پروفیسر تبسّم کے ساتھ ایک دفعہ عرشی صاحب کے ساتھ اور اکثر تنہا ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا...... ایک دفعہ عرشی صاحب اور تبسّم صاحب کی معیت میں آپ کے پاس گیا تو ان مضمونوں اور نظموں کا ذکر چھڑ گیا جو آج کل اُردو کے عام رسالوں میں شائع ہوتی ہیں۔ [3]

علاّمہ اقبال کے ساتھ صوفی تبسّم کی محبّت اور عقیدت کا سلسلہ جو زمانہ طالب علمی سے قائم ہوا تھا، قریباً اٹھارہ برس تک قائم رہا، ۱۹۳۲ء میں صوفی صاحب نے علاّمہ اقبال کی زندگی میں "علاّمہ اقبال کی شاعری" کے عنوان سے ایک طویل مقالہ تحریر کیا جسے علاّمہ اقبال

---

[1] "مئے شبانہ" از عبدالرشید طارق ملفوظات مرتبہ محمود نظامی لاہور۔

[2] "اقبال کے ہاں" از خضر تمیمی۔ مشمولہ ملفوظات ص ۲۱۶

[3] عمرِ عزیز کے بہترین لمحے از حفیظ ہوشیار پوری ایضاً ص ۱۳۶

نے بہت سراہا، اسی سال اورینٹیل کالج میگزین لاہور (اگست ۱۹۳۲ء) میں صوفی صاحب نے علامہ اقبال کے حکم کی تعمیل میں نصیرالدین ہاشمی کی کتاب "یورپ میں دکنی مخطوطات" پر تبصرہ تحریر کیا۔

علامہ اقبال کی وفات کے بعد تو صوفی صاحب نے علامہ اقبال کی شاعری اور فکر و فن کی تشریح اور ترویج کے لئے اپنی زندگی کو وقف کر دیا، انہوں نے فارسی، اُردو، پنجابی میں جتنا کچھ لکھا اس کا ایک تہائی اقبالیات پر مشتمل ہے، اپنی عمر کے آخری سال تو انہوں نے صرف اقبالیات کے فروغ کے لئے وقف کر دیئے تھے، چنانچہ فروری ۱۹۷۶ء میں صوفی صاحب کی انہی خدمات کے پیش نظر انہیں اقبال اکیڈمی کا وائس پریزیڈنٹ مقرر کر دیا گیا اور تادمِ آخر وہ اس عہدے پر رہے، علامہ کی صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں انہوں نے اقبال اکادمی کے لئے بڑی محنت اور کاوش سے کام کیا، انٹرنیشنل کانگریس ۱۹۷۷ء کے سلسلے میں بھی انہوں نے متعدد انتظامی کمیٹیوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا، ان خدمات کے اعتراف کے طور پر پنجاب یونیورسٹی نے انہیں ایک تمغہ پیش کیا۔ ۱۹۷۸ء میں پنشنرز ویلفیئر ایسوسی ایشن لاہور نے علامہ اقبال پر بہترین کُتب تحریر کرنے والے ادیب کے لئے علامہ اقبال میڈل صوفی صاحب کو دیا، محکمہ اطلاعات پنجاب کی طرف سے اقبال میوزیم منعقدہ ۱۹۷۵ء لاہور میں صوفی صاحب کی خدمات کو سراہا گیا اور انہیں مجسمہ اقبال پیش کیا گیا، مجلس انتظامیہ یوم اقبال کراچی ۱۹۶۶ء نے صوفی صاحب کو ان کی خدمات کے سلسلے میں مجسمہ اقبال اور تعریفی سند پیش کی۔ ۱۹۷۵ء میں جب صوفی صاحب پاکستان آرٹس کونسل کے چیئرمین بنائے گئے تو پہلی بار یہاں ہفتہ وار اقبال لیکچر اور تنقیدی مجالس کا اہتمام ہوا، گویا اقبالیات کی ترویج و ترقی کے سلسلے میں صوفی صاحب نے اَن تھک کام کیا، حتیٰ کہ اپنے سفرِ آخرت (۷ فروری ۱۹۷۸ء) کے وقت بھی صوفی صاحب اقبال میموریل فنڈ کے سلسلے میں ٹیلی ویژن پر قوم سے اپیل کرنے اسلام آباد گئے ہوئے تھے، واپسی پر لاہور ریلوے اسٹیشن پر انہوں نے

وفات پائی۔ اِنّا لِلّٰہ و اِنّا الیہ رٰاجعون، علّامہ اقبال کے سلسلے میں صوفی صاحب کی ان کاوشوں کو ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتے گا اور آئندہ علاّمہ اقبال پر کام کرنے والا محقق صوفی صاحب کی نگارشات سے رہبری اور رہنمائی حاصل کرے گا۔

اقبالیات کے ضمن میں صُوفی صاحب مرحوم کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں۔

۱ ۔ علّامہ اقبال کے نام سے ۱۹۵۵ء میں صوفی صاحب نے ایرانی پروفیسر مجتبیٰ مینوی کی فارسی کتاب کا اُردو ترجمہ کیا جسے بزم اقبال لاہور نے شائع کیا۔ بزمِ اقبال لاہور نے اب اس کا دُوسرا ایڈیشن شائع کیا ہے۔

۲ ۔ تیر و نشتر کے نام سے صوفی صاحب نے علاّمہ اقبال کے سو فارسی اور سو اُردو اشعار کا انتخاب کیا اور ان اشعار کو صوفی صاحب نے اپنے ہاتھ سے تحریر کیا پیکیجز لمیٹڈ لاہور نے ان دونوں کتابوں کو صد سالہ جشن ولادت ۱۹۷۷ء کے موقع پر شائع کیا۔

۳ ۔ انتخابِ کلامِ اقبال (اُردو۔ فارسی) کے نام سے صوفی تبسم کا یہ انتخاب اقبال اکادمی لاہور نے ۱۹۷۷ء میں شائع کیا۔

۴ ۔ حرف وصوت کے نام سے علاّمہ اقبال کے فارسی کلام کا انتخاب صوفی صاحب کا انتخاب کردہ ہے۔

۵ ۔ صد شعر اقبال، اقبال کا ایک شعر ریڈیو پاکستان لاہور سے صوفی صاحب کا ایک مسلسل پروگرام تھا جسے مرکزی اُردو بورڈ (اب اُردو سائنس بورڈ کہلاتا ہے) نے صد شعرِ اقبال کے نام سے ۱۹۷۷ء میں کتابی شکل میں شائع کیا۔ اب اس کا دُوسرا ایڈیشن بھی شائع ہو چکا ہے۔ اُردو اشعار کی طرح فارسی اشعار کی شرح ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ صد شعرِ اقبال (اُردو) کو ادارۂ مُصنفین پاکستان لاہور نے ۱۹۸۰ء میں تین ہزار روپے کا انعام دیا۔

۶ ۔ نقشِ اقبال ۔ اقبال کے فارسی کلام کا منظوم پنجابی ترجمہ ہے، یہ کتاب اقبال اکادمی لاہور نے ۱۹۷۷ء میں شائع کی۔

۷ ۔ سرا پردۂ افلاک ۔ "جاوید نامہ" کا آزاد منظوم اُردو ترجمہ ہے اور بقول صوفی تبسم اس آزاد ترجمے کے نظمی خط و خال تمثیلی منظر کے مزاج کے مطابق بدلتے چلے جاتے ہیں، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور نے یہ کتاب ۱۹۷۷ء میں شائع کی۔

۸ ۔ اقبال اور بچے (انتخاب) بچوں کے لئے اقبال کی نظموں کے اس انتخاب کو صوفی تبسم نے ترتیب دیا، تصاویر عائشہ تسلیم نے بنائیں اور پیکیجز لیٹڈ لاہور نے اس کتاب کو شائع کیا۔

۹ علامہ اقبال صوفی تبسم کی نظر میں۔ یہ کتاب ڈاکٹر نثار احمد قریشی پروفیسر شعبہ اُردو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد نے مرتب کی ہے اور اقبال اکادمی لاہور نے اسے شائع کیا ہے۔

باسمہٖ تعالیٰ

نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ گزرا، شالامار کا میلا جسے چراغاں کا میلا بھی کہا جاتا ہے، بڑے اہتمام اور تزک و احتشام سے منایا جاتا تھا۔ رسمی طور پر تو یہ میلا دو تین روز کے لیے ہوتا تھا اور اس کے لیے مارچ کے مہینے کے آخری ہفتہ اور اتوار کے دن مقرر تھے، جیسا کہ آج کل بھی ہوتا ہے۔ ہفتے اور اتوار کی درمیانی شب کو شاہ حسین کے مزار پر جنہیں عرفِ عام میں مادھولال حسین کہا جاتا ہے، چراغاں ہوتا تھا۔ لاہور کے رہنے والے بالعموم اپنی سہولت اور شوق کے تحت جب چاہتے آتے اور چلے جاتے۔ لاہور سے باہر کے قصبات میں بسنے والے چند روز کے لیے مستقل طور پر یہاں آکر مقیم ہو جاتے تھے۔

میرے ابا اور اُن کے احباب کی، خدا انہیں غریقِ رحمت کرے، یہ عادت تھی کہ وہ تقریباً ایک ہفتہ پہلے امرتسر سے چل کر لاہور پہنچ جاتے اور شہر میں کسی دوست کے ہاں ٹھہرتے اور کچھ کھانے پینے کی چیزیں اور ساز و سامان خرید لیتے، میلے میں رہائش کے لیے خیمے کا انتظام کرتے اور پھر شالامار کے آخری اور زیریں باغ پر جا کر اپنے جیسے دوسرے شائقین کے ساتھ اپنا خیمہ نصب کر لیتے۔ دن بھر تو ادھر اُدھر سیر میں گزرتا، البتہ رات کو باقاعدہ محفل گرم ہو جاتی جیسے کسی گھر میں کوئی خاص تقریب ہو۔ دھندلی سی یاد ہے کہ اندر خیمہ جگمگا رہا تھا اور باہر باغ کی روشوں کے درمیان فوارے چھوٹتے اور بعض جگہ چراغ جلتے اور نیچے گہری تہ میں اُن کا عکس دکھائی دیتا جیسے ستارے چمک رہے ہوں۔ میں معصوم انداز میں آسمان کی طرف دیکھتا اور پھر پانی کی تہ میں نظر

ڈالتا سوچتا شاید یہ تاروں بھرے آسمان کا عکس ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ آسمان پر بادل چھائے ہوتے تو میں حیرت زدہ ہو کر سوچتا ہی رہ جاتا اور کسی سے پوچھنے کی جرأت نہ ہوتی۔

ابّا مرحوم کے بعض دوستوں کی شادی نہیں ہوئی تھی اور جو شادی شدہ تھے، اُن کے ہاں ابھی کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی اس لیے وہ سب کے سب پیار سے مجھے ساتھ لیے پھرتے تھے۔ میں ان کی شفقت بھری گودوں میں جھولا جھولنے کا مزہ ابھی تک نہیں بھولا۔

یہ سب باتیں میرے انتہائی بچپن کی ہیں، تفصیلات اور جزئیات معلوم نہیں، اتنا یاد ہے کہ میلا ختم ہونے پر ہم سب شہر کا رُخ کرتے اور پھر ایک دو روز وہاں قیام کر کے امرتسر لوٹ جاتے۔

شہر لاہور میں یہاں کی معروف انجمن حمایت اسلام کا سالانہ اجلاس ماہ اپریل کے شروع میں منعقد ہوتا تھا اور تین دن تک جاری رہتا تھا۔ میرے والد بزرگوار اور اُن کے بعض صاحبِ ذوق احباب اُن کے ہمراہ انجمن کے جلسوں میں شریک ہوتے اور میں بھی اُن کے ساتھ ہوتا۔

ان شرکتوں کے نقوش میرے ذہن میں محفوظ نہیں رہے۔ سب سے پہلے جلسے کی کیفیت جس کا مجھے ہوش ہے۔ ۱۹۱۱ء کا جلسہ تھا۔ یہی جلسہ تھا جس میں مَیں نے پہلے پہل علامہ اقبال کو دیکھا۔

یہ اجلاس اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور کے پیچھے کے میدان میں منعقد ہوا تھا۔ یہ انجمن حمایت اسلام کا چھبیسواں سالانہ اجلاس تھا۔ یہ بات مجھے اس طرح یاد ہے کہ اس اجلاس کی پوری کارروائی چھپ کر آئی تھی اور میرے ابّا نے مجھے پڑھنے کے لیے دی تھی۔

مجھے یاد ہے کہ ہم لوگ میدان میں دری پر بیٹھے تھے اور سٹیج تھا جس پر بہت سی بزرگ ہستیاں تھیں جو باری باری اُٹھ کر آتیں اور تقریریں کرتیں یا شعر پڑھتیں یا کبھی کبھی

کوئی بحث سی بھی ہوتی۔ شعر پڑھنے والوں میں اقبال بھی تھے، انہوں نے اپنی نظم "شکوہ" پڑھی۔
ان کے شعر پڑھنے کا انداز انوکھا تھا، ان کے ایک ہاتھ میں اشعار کے کاغذ تھے،
وہ دوسرا ہاتھ اُٹھا کر شعر کو بلند آواز سے پڑھتے جس میں ایک خاص طرح کی دلکشی تھی۔
میرے ابا کو کلاسیکی موسیقی کا شوق تھا، وہ بمبئی سے گراموفون باجا اور ریکارڈ لائے
جو زیادہ تر اُس طرف کے رہنے والے مرہٹوں کے پکے راگ تھے۔ کچھ غزلوں کے ریکارڈ تھے۔
مگر وہ بھی پختہ دُھنوں کے تھے۔ اُن میں اُس دَور کی مشہور گانے والی گوہر جان کلکتے والی بھی
تھی۔ میں بچپن میں تنہا بیٹھا یہ ریکارڈ سنتا رہتا تھا۔ پختہ گانوں کے کچھ بول اور غزلوں کے شعر
مجھے ازبر تھے، میں گنگناتا رہتا تھا۔ ان گویّوں کی آوازیں میرے کانوں میں گونجا کرتی تھیں،
لیکن اقبال کی آواز کچھ اور ہی تھی، میرے لیے بالکل نئی۔
انہوں نے آواز نکالی اور میں جیسے چونک پڑا۔ میرے سامنے ایک غیر معمولی سفید چہرہ
تھا۔ آنکھیں، چہرے اور سر کے مقابلے میں نسبتاً چھوٹی لیکن اُن میں چمک تھی بڑی جاذب
چمک، وہ آنکھیں جھپکاتے تو مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے دو ستارے ٹمٹما رہے ہوں۔
اِدھر اُدھر بیٹھے ہوتے لوگ واہ واہ کہتے جاتے ہیں، میں کبھی دائیں طرف دیکھتا، کبھی
بائیں طرف، درمیان میں کچھ خاموشی سی طاری ہو جاتی اور میری نظر پھر سامنے اُن کے اُبھرے
ہوئے ہاتھ پر پڑ جاتی۔ میں اسی معصومانہ گھبراہٹ میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ میرے ابا نے بڑے پیار سے
مجھے بٹھایا اور کہا، دیکھو بیٹا، یہ ہمارے ملک کے بڑے شاعر ہیں۔ میں شاعر کے لفظ سے
مانوس تھا، یہ سنتے ہی میں خاموش ہو گیا۔
مجھ میں بچپن سے شعر کی سُوجھ بُوجھ تھی۔ نظم شکوہ کے بعض شعر سمجھتا تھا لیکن مجموعی طور
پر بات واضح نہ ہوتی تھی۔ اتنا پتہ چلتا تھا کہ شاعر خدا سے ہم لوگوں کی باتیں کر رہے ہیں لیکن
یہ سمجھ نہیں آتا تھا کہ وہ کیا باتیں کر رہے ہیں اور کیوں کر رہے ہیں۔
انسانی زندگی میں بعض دن ایسے خوش بختی کے دن ہوتے ہیں کہ اُن کی یاد عمر بھر تازہ

رہتی ہے۔ ۱۹۱۱ء کا سال میرے لیے ایسا ہی تھا، میری پیدائش اور میری چھوٹی بہن کی پیدائش کے بعد بارہ سال تک میری والدہ محترمہ کے کوئی بچہ نہ ہوا۔ گھر میں آنے جانے والی عورتوں کی باتوں سے ٹپکتا تھا کہ میری امّی بچے کے لیے دل ہی دل میں ترس رہی ہیں ۱۹۱۱ء میں میرے چھوٹے بھائی نے جنم لیا۔ امّی نے منّت مانی تھی ہم فروری ۱۹۱۱ء کو پیران پیر صابر کلیئری کے عرس پر گئے۔ وہاں سے فارغ ہوکر دلّی، آگرے، فتح پور سیکری اور اجمیر کی سیر کی۔ مارچ میں مَیں وظیفہ کے امتحان میں بیٹھا اور ضلع بھر میں اوّل رہا۔ اسی سال مَیں رسالہ "دلگداز" کا خریدار بنا اور پھر جب تک رسالہ بند نہیں ہوا، خریدار رہا۔ اپریل میں حضرت اقبال کو دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔

۱۹۱۹ء کا سال برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں ایک خاص حیثیت رکھتا ہے۔ امرتسر کے شہر میں جلیاں والے باغ، انگریزی جابریت و بربریت اور جنرل ڈائر اور اسی عہد کے فرعون مزاج لفٹیننٹ گورنر اوڈوائر کی بہیمانہ ستم رانیوں کی داستان نہ صرف اس برصغیر میں بلکہ ایشیا کی تاریخ یہاں کے باسیوں کے خون سے لکھی جا چکی تھی۔

شہر امرتسر کے رہنے والے لوگوں کے لیے یہ سال انتہائی کرب و ابتلا کا تھا۔ ۱۳ اپریل بیساکھی کے میلے کے آخری دن یہ حادثہ گزرا اور اس کے بعد نہ جانے کتنی اور کیسی کیسی قیامتیں اور گزر گئیں۔ کئی ایک مہینے نوحہ کرتے اور آہیں بھرتے کٹ گئے۔ بالآخر خبر آئی کہ اب کے آل انڈیا کانگرس اور مسلم لیگ کا اجلاس امرتسر میں ہوگا۔ نہ جانے کیوں اس سے یونہی ایک دُھندلی سی سکون کی لہر دلوں میں دوڑنے لگی۔

امرتسر کے مشہور و معروف میدان گول باغ میں کانگرس کا بڑا پنڈال نصب کیا گیا جس میں ایک لاکھ نشستوں کی گنجائش تھی۔ کانگرس کی صدارت موتی لال نہرو کے سپرد ہوئی۔

اقبال کا ایک قطعہ جلیانوالہ باغ سُرودِ رفتہ میں ہے جو ان کے مروّجہ مطبوعات میں نہیں ہے۔

مسلم لیگ کے اجلاس کے لیے کنہیالال تھیٹر منتخب ہوا، ہال چھوٹا تھا لیکن آزاد محفلیں بالعموم یہیں ہوا کرتی تھیں۔ اس اجلاس کی صدارت حکیم محمد اجمل خاں نے کی۔ اس زمانے میں تحریکِ خلافت زوروں پر تھی، طے پایا کہ کانگرس کے تیسرے اور آخری اجلاس کے بعد شام اور رات کو خلافت کے جلسے ہوں۔ اس کی صدارت مسز اینی بسنٹ نے کی۔

میں اپنے ایک سکھ دوست کے ہمراہ جو طبعاً نصف مسلمان تھے، کبھی کانگرس کے جلسے میں جاتے اور کبھی مسلم لیگ کے لیکن ہمارا بیشتر وقت اسی جلسے میں گزرتا۔ شاید اس لیے کہ یہاں ہمیں کچھ اُنس و یگانگت کا احساس ہوتا تھا اور ہمیں جگہ بھی سٹیج کے قریب تر مل جاتی تھی۔

سٹیج کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ حکیم اجمل خاں مرحوم کی میز سب سے آگے وسط میں تھی۔ دوسرے حضرات ان کے عقب میں نصف دائرے میں بیٹھے تھے ڈاکٹر اقبال صدر مجلس کی بائیں طرف اور ہماری دائیں طرف تشریف فرما تھے۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ اُن کے ہاتھ میں چھڑی تھی جسے وہ کبھی کرسی کے بازو پر رکھ دیتے اور کبھی دونوں ہاتھوں سے تھامے ٹیک لگا کر سیدھے بیٹھ جاتے جیسے کچھ سوچ رہے ہوں۔

شہر میں ان جلسوں کے شروع ہوتے ہی یہ خبر پھیل گئی کہ حکومت برطانیہ نے تمام اہم سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا ہے اور وہ امرتسر پہنچ رہے ہیں جس دن کا میں تذکرہ کر رہا ہوں وہ دوسرا دن تھا۔ اجلاس کے کارپردازوں نے خوشخبری سنائی کہ علی برادران اور مولانا حسرت موہانی وغیرہ آگئے ہیں، تھوڑی دیر میں یہاں تشریف لائیں گے۔

جلسے کی کارروائی شروع تھی، مولانا شوکت علی شیر ببر کی طرح داخل ہوئے۔ اُن کے پیچھے اُن کے بھائی مولانا محمد علی جوہر تھے۔ قد میں کم لیکن چیتے کی طرح چوکنے اور ساتھ مولانا حسرت موہانی، جیل میں چکی کی مشقت اور سخن گوئی دونوں کی ریاضت کرنے والے۔

محفل میں تازہ گرمی آگئی۔

حسرت موہانی نے تاخیر سے پہنچنے کی توجیہہ بیان کرتے ہوئے فرمایا: حضرات ہم

آپ سے معذرت خواہ ہیں، رہائی تو کل صبح سے پہلے ہو چکی تھی لیکن سرکار عالی مدار کے کارفرما ہمیں جگہ جگہ لیے پھرے، ہماری حالت گویا یہ تھی:

یاں سے واں، واں سے وہاں حکم ہوا وصل کی شب
ہم بچھاتے ہی اٹھاتے رہے بستر اپنا

پھر فرمایا کہ ہمیں اطلاع ملی ہے کہ وائسرائے بہادر ملک چھوڑنے پر آمادہ ہیں، آپ سے باتیں کرتے کرتے ابھی ایک شعر نازل ہوا ہے، سُن لیجئے:

تو جو جانے پہ ہے راضی تو ترے سر کی قسم
کر کے چندہ ابھی لے دیں تجھے لنڈن کا ٹکٹ

اس کے بعد اقبال اٹھے اور انہوں نے حسب ذیل قطعہ پڑھا جس میں حافظؔ کے ایک شعر کی تضمین کی گئی تھی۔

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند
مشکِ اذفر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے
مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر
کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند
"شہپرِ زاغ و زغن در بندِ قید و صید نیست
ایں سعادت قسمت شہباز و شاہیں کردہ اند" [1]

ان شعروں پر بہت داد ملی، تالیاں بجیں اور جلسے میں ایک ہیجان سا پیدا ہوا۔ کچھ دیر رہا شدہ مہمانوں کی تقریریں ہوئیں۔ پہلے مولانا شوکت علی آئے۔ کانگریس میں دُھواں دھار تقریر کرنے سے اُن کا گلا بیٹھ گیا تھا۔ مولانا محمد علی کے اندازِ تخاطب میں جوش بھی تھا اور

---

[1] اسیری کے عنوان سے بانگِ درا میں موجود ہے۔ مرتب

ثقاہت بھی۔ یہ سب کچھ بطور جملۂ معترضہ کے تھا۔ ہنگامہ ختم ہوا تو جلسے کی کارروائی پھر معمول پر آگئی۔ کسی ریزولیوشن کے سلسلے میں سید حسین ایڈیٹر انڈی پنڈنٹ کی انگریزی تقریر نے بہت متاثر کیا۔ بے حد خوبصورت اور نستعلیق لہجہ تھا۔ ان کا جملہ ابھی تک ذہن میں محفوظ ہے۔

"SOME SAY WE ARE INDIAN FIRST AND THEN MUSLIM, OTHERS SAY WE ARE MUSLIM FIRST AND THEN INDIAN, BUT I SAY LADIES AND GENTLEMEN, I AM INDIAN AND MUSLIM AT THE SAME TIME."

یاد ہے کہ کچھ وقفے کے بعد انہوں نے اُردو میں بھی تقریر کی جس کے حسین لب و لہجے نے ہمیں اور بھی مسحور کر دیا۔

اچانک سروجنی نیڈو جنہیں لوگ بُلبلِ ہند کے نام سے پکارتے تھے، سٹیج کے عقب سے نمودار ہوئیں۔ سٹیج نشینوں میں ایک ارتعاش سا پیدا ہوا، بے ساختہ اُٹھ کھڑے ہوئے، نووارد نے اُن پر ایک طائرانہ نظر ڈالی، سٹیج پر اتفاق سے کوئی نشست خالی نہ تھی لیکن ہر شخص اپنی کرسی سے ذرا ہٹ کے کھڑا تھا، یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ہر ایک یہ چاہتا ہے کاش وہ میرے پہلو میں آ بیٹھے۔ اتنے میں اُس کی نظر اقبال پر پڑی اور وہ بے تابی کے عالم میں آگے بڑھی۔ اپنا ریشمی رومال ہوا میں لہلہاتی وہاں پہنچ گئی، عجب سماں تھا۔ میری اور میرے دوست کی آنکھیں ملیں، ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیے۔

اچھی طرح یاد نہیں لیکن اس واقعہ کے بعد معارف کا پرچہ آیا، مولانا سید سلیمان ندوی نے جو وہاں موجود تھے، اپنے شذرات میں اس منظر کی ہو بہو تصویر کھینچ دی تھی۔

میں نے سوچا، ہمارا اندازہ غلط نہیں تھا۔

اس میں اہلِ نظر کا قصور نہیں تھا۔ حسن سے پوچھنا چاہیے تھا: "چنیں خوب چرائی"

حکیم محمد حسین عرشی کو میں نے بچپن میں شعر کہتے سُنا تھا، ڈاکٹر سیف الدین کچلو ولایت سے فارغ التحصیل ہوکر امرتسر آئے تھے۔ وہ ہر ہفتے اپنے مکان پر اُس وقت کے دستور کے مطابق طرحیہ مشاعرہ کراتے تھے جس کی صدارت بالعموم حکیم فیروز الدین فیروز طغرائی کیا کرتے تھے۔ بعد میں عرشی صاحب کو ۱۹۱۹ء میں جلیانوالے باغ کے مشاعرے میں انگریز حکومت کے خلاف نظم پڑھتے بھی سنا تھا۔ ان کی نظم بڑی پُر مغز ہوا کرتی تھی۔ مجھ پر اور میرے دوستوں پر اُس کا بڑا گہرا اثر ہوتا تھا۔

۱۹۲۰ء کے اوائل میں وہ ساتھ کے محلے سے اٹھ کر جہاں اُن کی زرگری کی دُکان تھی، ہمارے محلّے میں آگئے۔ یہ مکان، میرے ابا کی دُکان اور اُس فلیٹ سے جہاں مَیں اور میرے ہم جماعت احباب پڑھا کرتے تھے، تقریباً ساتھ ساتھ تھیں، یہاں اُن سے باقاعدہ تعارف ہوا۔ ذوقِ سخن کے اشتراک کے باعث میل جول بڑھ گیا اور ہم ایک دوسرے سے بہت مانوس ہو گئے۔

یہ زمانہ تحریک موالات کا تھا۔ اقبال ایک عرصے سے خاموش تھے مولانا ظفر علی خاں اپنے روزنامہ "زمیندار" میں عرصے تک پُر زور نظمیں اور مضمون لکھتے رہے لیکن اقبال ٹس سے مس نہ ہوئے۔ لوگ اُن کی اس خاموشی پر حیران تھے۔ میں عرشی صاحب کے زورِ قلم اور اندازِ بیان سے متاثر ہو چکا تھا۔ میں نے اُن کو اقبال سے خطاب کرنے پر اُکسایا۔[1] وہ کچھ روز اپنے منکسر انداز میں ٹالتے رہے لیکن آخر مان گئے اور حسب ذیل فارسی اشعار لکھے:

اَے ترنّم ہای رنگینت گلستانِ سُخن!

معنیٔ عیسیٰ دمت بخشندۂ جانِ سُخن

ای حیاتِ تازہ دادی نغمہ را از نُطقِ خویش

گشتہ ای شور افگنِ ارض وسما از نطقِ خویش

---

[1] مولانا محمد حسین عرشی مرحوم جب زندہ تھے تو انہوں نے مجھے بتایا بلکہ لکھ کر بھی دیا، یہ تحریر

از عروسِ طبع برما جلوہ ہا پاشیدہ ای
در چمن زارِ معانی تازہ گلہا چیدہ ای
شعلہ سوز اندوز از آتش نوائی ہای تو
بادہ کیف آموز از تخییلِ ذوق افزای تو
یافت از تو مرکزی ہنگامۂ بی تابِ ما
ریختی تخمِ سکوں در مزرعِ سیمابِ ما
لیکن ای اقبال ایں رنگیں نوائی تا بہ کی
از نفس گرمی و از دل شعلہ زائی تا بہ کی
ای توئی در آشیاں و گلشنت بربادرفت
نغمہ ماندی و پروازِ تو با صیاد رفت
خیز و گلبانگِ دہل در گنبدِ خضرا فگن
از قبور آیند خلقی شورِ صور آسا فگن
خیز و صوتِ خود بہ آہنگ رجز تبدیل کن
قطرہ داری بیادر، در شرر تحلیل کن
خیز از یں کنجِ متانت جلوۂ برما فگن
ہاں بیا ہمچوں سنائی گوی در میداں فگن

حسب ذیل ہے:

"میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میری اس نظم کے محرک ماسٹر شیخ عبید اللہ ایم۔اے منشی فاضل اور شیخ عبد الرحمٰن نومسلم تھے، اور یہ واقعہ میری اور صوفی صاحب کی ملاقات سے پہلے کا ہے جب میری دکان بازار کھلونیاں امرتسر میں تھی، صوفی صاحب کو اس میں سہو ہوا ہے۔"

ٹے علامہ اقبال کو انگلستان سے تعلیم حاصل کر کے آتے ہوئے ابھی چند برس ہی گزرے تھے کہ پہلی جنگِ عظیم

شعر بڑے برجستہ اور تہ دار تھے۔ اُسی وقت انہیں نقل کر لیا گیا اور مدیر "زمیندار" کے نام بھیج دیا گیا۔ یہ نظم فوراً چھپ گئی۔ جب مولانا ظفر علی خاں کے روزنامہ زمیندار میں یہ پیغام شائع ہوا تو مولانا وہ پرچہ لے کر خود علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور یہ پیغام علامہ کے گوش گزار کیا۔ علامہ نے جواب میں فرمایا۔ میں اپنا پیام مثنوی اسرار و رموز میں دے چکا ہوں تاہم انہوں نے حسب ذیل اشعار اشاعت کے لیے دیے۔

دانی کہ چیست شیوۂ مستانِ پختہ کار
عرشی گماں مدار کہ پیمانہ ام شکست
دارم ہنوز از کرم ساقیٔ حجاز
آہے درونہ تاب کہ خیزد ز سینہ مست
از شاخسارِ فطرتِ من می دمد ہنوز
آں لالۂ کہ موجِ نسیمے دلش نہ خست
لیکن شنیدۂ کہ دمِ گردشِ شراب
پیرِ عجم چہ گفت بہ رندانِ مے پرست
دانا کہ دید شعبدۂ چرخِ حقہ باز
ہنگامہ باز چید و در گفتگو بہ بست

نے دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جب ۱۹۱۸ء میں جنگ ختم ہوئی تو سارے عالم اسلام پر حیرت و یاس اور بے بسی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ بلند پایہ شاعر عموماً سلیم الطبع ہوتے ہیں۔ علامہ اقبال کے دل پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ وہ بالکل چپ ہو کر رہ گئے جس پر ملک کے اخبارات و جرائد اور مدبرین نے علامہ صاحب کی مہر سکوت توڑنے کے لیے سعی و کاوش کی۔ اُن میں ایک نحیف آواز جناب عرشی صاحب کی تھی جس پر علامہ اقبال نے پھر سے لب کشائی شروع کر دی۔

عرشی صاحب کی عمر اس وقت ۲۵ سال کے لگ بھگ ہو گی۔ یہ شرف غالباً عرشی صاحب ہی کو حاصل ہے کہ علامہ اقبال نے ان کو اپنے کلام میں مخاطب فرمایا۔ یہ بھی عرشی صاحب کی علامہ اقبال سے پہلی قلمی ملاقات۔ اس کے بعد یہ سلسلہ بڑھتا گیا۔

نظم اسیری اور اس نظم میں دونوں جگہ حافظ شیرازی کے شعروں کی تضمین کی گئی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ اقبال نے قدیم اساتذۂ فارسی کے کلام کا کتنا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اس انداز سے کیا تھا کہ ان کے اشعار ذہن میں اس طرح مستحضر تھے کہ جب موقع آتا اپنی زندگی کے نئے سے نئے تاثرات واحساسات کو اُن سے فی الفور وابستہ کر لیتے اور اس تطابق سے اساتذہ کے اشعار کے نامعلوم پہلو ہمارے سامنے آجاتے۔

ان دنوں حکیم فیروز الدین طغرائی جموں میں اکبر اسلامیہ ہائی سکول میں معلّم تھے۔ انہوں نے علامہ اقبال کی یہ نظم "زمیندار" میں پڑھی لیکن اُن کی نظر سے عرشی کی نظم نہیں گزری تھی، اقبال کے جواب سے متاثر ہو کر یہ شعر لکھے جو "زمیندار" میں چھپ گئے۔

عرشی اور اقبال

امروز در فضائے زمیندار دیدہ ام
زاقبال پاسخے کہ دلِ آرزو بخست
نا دیدہ خاطرم بخطابِ تو وا رسید
نشنیدہ مدعائے تو در ذہن من نشست
خواہم کہ نکتہ نکتۂ لسبر ایم دریں خصوص
ہر چند غم نوائے نشاطِ مرا شکست
عالم بصد ہزار زباں کُنجِ خامشی است
شاعر درآں میانہ لبِ نطق پرور است

باشد برائے دیدۂ بینا مقامِ حیف
گر کور و چاہ دید و صدایش نداد دست
گیرم کہ گنجِ فلسفہ و حکمت است کس
اما چہ سود مُہرِ سکوت از لبش بہ بست
بپذیر اعتذار ز طغرائیِ حزیں
دانی کہ اُو ز بندِ الم و ہیچگہ نرست

مولانا ظفر علی خاں نے اسی زمین میں اردو میں نظم کہی اور عرشی، علامہ اقبال اور حکیم طغرائی کی نظموں کا جائزہ لیتے ہوئے شیخ سعدی کے اس مصرعے "حقّا کہ با عقوبتِ دوزخ برابر است" کی تضمین کی ہے۔ یہ نظم حسب ذیل ہے:-

بندہ نواز ہم سے نہیں کچھ چھپی ہوئی
پیرِ فلک کی شعبدہ بازی کی بُود و ہست
مانا کہ آسمان سے شمس و قمر کی فوج
پیہم اُتر رہی ہے کہ ظلمت کو دے شکست
مانا کہ ان کو جو نظر آتے ہیں سربلند
چرخِ ستیز کار کرے گا زبون و پست
لیکن نہ قولِ سعدیٔ شیراز بھولیے
چھوٹا نہیں جو ہاتھ سے سررشتۂ الست
رفتن بہ پای مردیٔ ہمسایہ در بہشت
حقّا کہ با عقوبتِ دوزخ برابر است

اس کے بعد مولانا ظفر علی نے ان چاروں نظموں (عرشی، علامہ اقبال، حکیم طغرائی اور اپنی نظم کو) کو ایک ساتھ دوبارہ شائع کیا۔

مولانا ظفر علی خاں اور حکیم طغرائی امرتسری کے اصرار کے سامنے علامہ اقبال نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور ایک نظم لکھی جس کے تین اشعار حسب ذیل ہیں :۔

شعلہ در آغوش دارد وعشق بی پروای من
برنخیزد یک شرار از قسمت نازای من
تیغ لا در پنجۂ ایں کافرِ دیرینہ دہ
باز بینی گر درجہاں ہنگامۂ اِلای من
بہر دہلیزِ تو از ہندوستاں آوردہ ام
سجدۂ شوقی کہ خون گردید در سیمای من

عرشی صاحب، حکیم طغرائی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ حکیم صاحب سے کئی سال تک مختلف علوم کا درس لیا تھا۔ اس گھرے ربط کی وجہ سے طغرائی جموں سے امرتسر آئے۔ اُن کی خاطر مدارات کا اہتمام میرے سپرد رہا۔ میں چند دنوں میں اُن کی محبت سے بے حد متاثر ہوا اور جب وہ واپس جموں گئے تو میں نے عرشی صاحب سے مشورہ کر کے طغرائی صاحب سے بذریعہ خط و کتابت تلمذ حاصل کر لیا۔ حکیم[1] صاحب نے میرا تخلص اصغر سے تبسم کر دیا۔ یہ کہہ کر کہ ہمیشہ متبسم رہنے والے کے لیے بے حد موزوں ہے۔

رابطہ بڑھ جانے کی وجہ سے ۱۹۲۰ء ہی میں مجھے ہمراہ لے کر لاہور کسی عزیز سے ملنے آئے۔ طغرائی صاحب کے ایک بھائی شاہ دین اُن سے عمر میں بہت بڑے تھے، اُن کی ایک صاحبزادی لاہور میں بیاہی تھی، ہم اُن کے مکان میں آکر ٹھہرے۔

---

[1] مولانا محمد حسین عرشی مرحوم کے بقول "صوفی صاحب بھول گئے دراصل میں نے اُن کا تخلص تبسم اور مولانا غلام محمد کا ترنم تجویز کیا تھا۔ دونوں میرے پاس شاگرد بننے کے لیے آئے اور میں نے اپنی علت کے مطابق حکیم صاحب کی تعظیم کے خیال سے انہیں حکیم صاحب کی طرف منتقل کر دیا۔"

لاہور میں نو گزے کی قبر سے ذرا فاصلے پر دو راستے ہیں۔ایک پانی والا تالاب کی طرف جاتا ہے اور دوسرا بارود خانہ بازار میں۔

بارود خانہ بازار سے آگے بڑھیں تو کچھ فاصلے پر دائیں جانب ایک گلی "بالنسا نوالہ طویلہ" کے نام سے مشہور ہے، اس میں داخل ہونے پر ایک جگہ "اڑانتلیاں" کے نام سے مشہور ہے، یہ کوچہ بعض اعتبار سے لاہور میں بہت معروف تھا۔ اُن دنوں یہاں ایک حکیم غلام محمد گیلانی رہتے تھے جن کا ایک پورے صفحے کا اشتہار "اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہوگا" مولانا ظفر علی خاں کے مشہور و معروف روزنامہ "زمیندار" میں چھپا کرتا تھا۔

اس گلی میں داخل ہوتے ہی تھوڑے فاصلے پر ایک حویلی میر سردار حسین کی تھی، جس مکان میں ہم آکر ٹھہرے، یہی حویلی تھی۔

دن بھر میر صاحب کا تو رسمی طور پر گزر جاتا لیکن رات کو چند احباب کا اجتماع ہوتا۔ اُن میں ڈاکٹر اقبال بھی ہوتے۔

یہیں میں نے شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی کو دیکھا۔ وہ ڈاکٹر صاحب کے بے تکلف دوست تھے، آپس میں ناز و نیاز کی باتیں ہوئیں۔ کچھ معاشقوں کا تذکرہ، کچھ واردات قلبی کا برملا اظہار، کبھی فی البدیہہ اشعار، کہیں شوخ پھبتیوں کی بھرمار لیکن ہر بات مزے میں ڈوبی ہوئی اور حرف و سخن کی شیریں رعنائیوں سے لپٹی ہوئی۔

میں پاسِ ادب سے ان بزرگوں سے ذرا پیچھے ہٹ کے بیٹھ جاتا تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ میری موجودگی کو انہوں نے کسی طرح بھی محسوس نہیں کیا۔ مجھے یاد ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی میری طرف جب بھی نظر اٹھتی تو ان کے بے تکلف لہجے اور تبسم آمیز گفتگو میں ذرہ بھر بھی فرق نہ آتا۔

اتنا عرصہ گزر چکا ہے لیکن یہ دو تین راتوں کی یاد اب تک تازہ ہے۔ اس واقعہ کے ایک آدھ سال بعد میں خود لاہور میں آگیا اور پھر علامہ اقبال کی نظمیں میں نے حمایتِ اسلام

کے جلسوں میں سُنیں۔

"خضرِ راہ" اور "طلوعِ اسلام" دونوں طویل نظمیں اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ گیٹ کے صحن میں رات کو پڑھی گئیں۔

خضرِ راہ دو نشستوں میں ختم ہوئی اور مجھے یاد ہے کہ اس نظم کی کیفیت حاضرینِ جلسہ کے دلوں میں مہینوں چٹکیاں لیتی رہی۔

۱۹۲۱ء میں مَیں نے ایف۔سی کالج لاہور میں داخلہ لیا اور علامہ اقبال سے نیازمندی کا یہ سلسلہ آگے بڑھتا چلا گیا۔

۲۳-۱۹۲۲ کا واقعہ ہے کہ میرے مرحوم استاد حافظ محمود شیرانی مجھے اُن (علامہ اقبال) کے پاس لے گئے۔ اس وقت وہ میکلوڈ روڈ پر رہتے تھے۔ انہوں نے اس طرح میرا تعارف کرایا کہ یہ میرا طالب علم ہے اور وہاں سے پھر ملاقاتوں کا سلسلہ جاری ہوا اور اس سلسلے کے بڑھنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میرے جو ہم جماعت اور دوست تھے اُن میں ایک ڈاکٹر تاثیر تھے۔ ہم ایک دوسرے سے پہلے آشنا تھے، جب میں لاہور آیا تھا تو غائبانہ تعارف تھا کیونکہ ہم ایک دوسرے کے مضامین اور نظمیں پڑھتے تھے اور پھر ہم مل کر اُن (علامہ اقبال) کے ہاں جایا کرتے تھے[1]۔

اگرچہ میں فارغ التحصیل ہو کر لاہور سے اپنے وطن چلا گیا تھا تاہم اُن سے ملاقات کا اشتیاق ہمیشہ دامن گیر رہتا اور میں گاہے گاہے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا اور اُن کی عالمانہ گفتگو سے استفادہ کرتا رہتا۔

علامہ اقبال کے دوست احباب کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ ان دوست احباب میں اچھے پڑھے لکھے لوگ شامل ہوتے تھے اور مختلف پیشوں سے تعلق رکھتے تھے۔ الغرض علامہ اقبال کے گھر کا دروازہ ہر اُس شخص کے لیے کھلا ہوتا تھا جو ان سے ملنے کا متمنّی ہوتا تھا۔

---

[1] اقبال کے شب و روز ریڈیو انٹرویو۔ صوفی تبسّم

علّامہ اقبال اور خواجہ احمد دین امرتسری

خواجہ احمد دین امرتسری ایک نامور عالم دین ہوئے ہیں۔ آپ امرتسر میں ۱۸۶۱ء میں پیدا ہوئے۔ مکتبی تعلیم میٹرک تک حاصل کی۔ ان کا تاریخ اسلام اور تاریخ عالم کا بہت وسیع مطالعہ تھا۔ قرآن حکیم کے وسیع مطالعہ کے ساتھ ساتھ حدیث پر بھی عبور حاصل کیا۔ دینیات کے لیے عمر وقف کر رکھی تھی۔ جن اساتذہ سے دینی علوم میں کسبِ فیض کیا، اُن میں مولانا غلام العلی قصوری کا نام قابلِ ذکر ہے۔

خواجہ[1] احمد دین صاحب اچھے ذہین اور طباع تھے۔ اُن کا مطالعہ بہت وسیع تھا، وہ علم کا بحرِ بیکراں تھے۔ انہوں نے بہت ہی کم مکتبی تعلیم حاصل کی۔ اُن کا علم وہبی تھا۔ انہوں نے اپنے اساتذہ سے بہت کچھ حاصل کیا اور پھر اپنے وسیع مطالعہ اور معلومات کے باعث اس زمانے کے مشہور و معروف علما و فضلا میں شمار کیے جانے لگے۔ حتیٰ کہ اس زمانے میں علامہ اسلم جیراجپوری، علامہ سید سلیمان ندوی اور علامہ اقبال ایسی باکمال شخصیتیں بھی اُن کی قدر کرتی تھیں اور اُن کی عظمت کی معترف تھیں۔

خواجہ احمد دین صاحب ایک معلّم تھے۔ ریاضی، فارسی اور اُردو کی تدریس اُن کا پیشہ تھا۔ ریاضی میں انہیں خاص ملکہ حاصل تھا۔ اُردو، فارسی، عربی اور انگریزی میں فاضلانہ

---

[1] واضح رہے کہ حضرت مرحوم کو تینوں القاب سے ملقب کیا جاتا تھا، مولوی، مولانا اور خواجہ۔ آخری لقب آپ کی قومیت سے متعلق ہے اور اوّل الذکر دو لقب علمیت کے بخشندہ ہیں۔

مہارت رکھتے تھے۔ یہ سب اللہ تعالےٰ کی دین تھی۔ ایک معمولی معلّم ہونے کے ساتھ ساتھ قرآن حکیم پر کافی عبور حاصل تھا۔ علم منطق اور فلسفہ کی باریکیوں سے پوری طرح واقف تھے۔ علمِ فقہ سے خاص ذوق رکھتے تھے، خصوصاً علمِ میراث میں تجدید و اجتہاد کے درجے تک پہنچے ہوئے تھے۔ علم نباتات کی باریکیوں کو خوب سمجھتے تھے، موسیقی میں بھی درک رکھتے تھے۔ فلکیات کے عملی مشاہدات اور حسابات سے پوری طرح واقف تھے۔

جب گفتگو کرتے تو آپ کی گفتگو عالمانہ اور فاضلانہ نکتوں سے پُر ہوتی۔ جمعہ کو خطبہ دیتے یا درسِ قرآن میں مشغول ہوتے تو لوگوں کا خاصا اجتماع ہوتا اور حاضرین پوری توجہ اور انہماک سے خواجہ صاحب کی باتیں سنتے، آپ کی مجالس میں حاضرین کو سوالات کرنے کی کھُلی اجازت ہوتی تھی۔ ہر سوال کے بعد آپ کی زبان سے معلومات کا چشمہ رواں ہو جاتا تھا۔ قرآن حکیم کے ایک ایک لفظ کی محققانہ اور مفصل تشریح کرتے تھے۔ طبیعت میں عاجزی اور انکساری کا یہ عالم تھا کہ غیر معمولی تبحر علمی کے باوجود اپنے آپ کو ہمیشہ طالب علم ہی سمجھتے تھے۔

خواجہ صاحب نے قرآن حکیم کی مبسوط تفسیر لکھی جو "بیان اللّناس" کے نام سے شائع ہوئی لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ یہ تفسیر جو سات منزلوں پر مشتمل ہے، پاکستان کے معرض وجود میں آنے پر امتِ مسلمہ کی دوسری مطبوعات کے ساتھ امرتسر ہی میں رہ گئی۔ یہ تفسیر ایک عرصے سے نایاب تھی اور کسی قیمت پر دستیاب نہیں تھی لیکن اس امر کی سخت ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ قرآن مجید کے طالب علموں کے لیے عصرِ حاضر کی اس عظیم الشان تفسیر سے استفادے کی کوئی صورت نکل آئے۔ اس احساس کی بنا پر مولانا محمد حسین عرشی امرتسری نے اپنی پیرانہ سالی کے باوجود بڑی محنت اور کاوش سے بیان اللّناس کی ایک تلخیص تیار کی جو قرآن[1] سے قرآن تک کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ اس تلخیص کی سب

---

[1] قرآن سے قرآن تک۔ مصنفہ مولانا محمد حسین عرشی

سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اصل کتاب کے تمام مطالب کم سے کم الفاظ میں اس طرح سمیٹ لیے گئے ہیں کہ اس سے اتنا ہی استفادہ کیا جا سکتا ہے جتنا اصل کتاب کے مطالعے سے ممکن تھا۔ علامہ عرشی کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور انہیں خواجہ صاحب سے سالہا سال کسبِ فیض کا موقع ملا ہے۔ اتنی خصوصیات کے پیشِ نظر بیان اللّناس کی تلخیص[1] کے لیے انہی کا قلم موزوں ترین قلم تھا۔ ان کی یہ کاوش ہر لحاظ سے کامیاب ہے۔

خواجہ صاحب کی تفسیر میں جو سات جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس میں ہر جلد کے اختتام پر اس قسم کے منکسرانہ الفاظ ملتے ہیں :-

"قرآن پاک سے جو کچھ میری سمجھ میں آیا ہے، اُسے لوگوں کے سامنے پیش کر دیا ہے اگر کوئی صاحب الفاظِ قرآن سے اس کا زیادہ اچھا بیان پیش کر دے تو میں دل سے اس کا شکریہ بجا لاؤں گا۔"

خواجہ صاحب علمِ ہیئت کے ماہر بھی تھے۔ قرآن حکیم اور سائنس علوم معقول کو تطبیق دینے میں آپ کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ ۱۹۰۴ء میں آپ نے سُنا کہ سورج میں ایک بہت بڑا سیاہ داغ پڑ گیا ہے تو آپ نے اکثر دوست احباب اور عزیز و اقارب سے ذکر کیا کہ ایک خوف ناک زلزلے کا خطرہ ہے۔ چنانچہ ۴ اپریل ۱۹۰۵ء کو ایک ہیبت ناک زلزلہ آیا جس کی یاد آج تک دلوں سے محو نہیں ہو سکی۔ جب آپ سے پوچھا گیا کہ آپ کو اس قیامت خیز زلزلے کا علم کیسے ہوا تو اس کے جواب میں فرمایا۔ مجھے وحی یا الہام سے اس کا علم نہیں ہوا تھا اور نہ اس پیش گوئی میں میری کوئی خصوصیت ہے بلکہ یہ قرآن حکیم کی خوبی ہے کہ اس میں بے شمار علمی حقائق موجود ہیں، چنانچہ انہوں نے قرآن حکیم کی یہ

---

[1] صوفی تبسم صاحب نے برسوں حضرت خواجہ کمال الدین امرتسری کے فیضانِ صحبت سے استفادہ کیا اور ان کی تفسیر بیان اللّناس کی منزل اوّل کا دیباچہ بھی لکھا ہے۔

آیات تلاوت کیں :-

اِذَا الشَّمۡسُ کُوِّرَتۡ ۔ وَ اِذَا النُّجُوۡمُ انۡکَدَرَتۡ ۔ وَاِذَا الۡجِبَالُ سُیِّرَتۡ ۔

(اس کی روشنی میں داغ پیدا ہو جانے کی وجہ سے کمی واقع ہو جاتی ہے)

اور جب ستارے میلے ہو جاتے ہیں۔ سورج کی روشنی میں کمی کے سبب ستارے گدلے ہو جاتے ہیں تو اس کے نتیجے کے طور پر پہاڑ اڑائے جاتے ہیں یعنی زلزلے آتے ہیں۔

چونکہ آفتاب میں داغ پڑنے کی اطلاع موصول ہوئی تھی، اس لیے قرآن کی مندرجہ بالا تعلیم کے پیش نظر مجھے خیال ہوا کہ خوفناک زلزلہ آئے گا اور اس کا علم مجھے قرآن مجید سے ہوا تھا اور قرآن مجید میں ایسے کروڑوں علم بھرے پڑے ہیں۔

حکیم الامت علامہ اقبال علوم جدیدہ کے تو بحرِ ذخار تھے ہی، اسلامیات کے قدیم ذخائر پر بھی وسیع اور گہری نظر رکھتے تھے۔ جس زمانے میں آپ خطباتِ مدراس کی تصنیف و تشکیل میں مصروف تھے، آپ کو قرآن حکیم کے بعض خاص و اہم مسائل میں مشورہ اور استفادہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ملک کے مشاہیر علما کے اسمائے گرامی کی فہرست آپ کے سامنے تھی لیکن اس ہجوم میں آپ کی نظر ایک گمنام گوشہ نشین پر پڑی جو کسی دارالعلوم کا سند یافتہ نہیں تھا اور نہ ہی کسی درس گاہِ اسلامی کی مسندِ درس پر مشرف، ایک معمولی سکول ماسٹر جس کو اسلام، قرآن حکیم اور مختلف علوم سے فطری لگاؤ تھا۔

اب میں اُن خطوط کا تذکرہ کرتا ہوں جو علامہ اقبال نے میرے نام لکھے اور جن میں خواجہ احمد دین کے ساتھ ملاقات کرنے پر زور دیا گیا تھا اور بالآخر یہ خط و کتابت ملاقات پر منتج ہوئی۔

ذیل کا خط[۳] علامہ مرحوم نے ۲ ستمبر ۱۹۲۵ء کو میرے نام لکھا۔ اسی زمانے میں امرتسر

---

[۳] بلاغ امرتسر ۱۹۳۸ ماہ اگست ۔ منقول از "راوی" لاہور

سے رسالہ بلاغ شائع ہوتا تھا۔ اسی رسالے میں خواجہ احمد دین مرحوم کے مضامین اور قرآن حکیم کی تفسیر انہی کے قلم سے شائع ہوتی تھی۔ یہ رسالہ ڈاکٹر اقبال صاحب کی خدمت میں باقاعدہ پہنچتا تھا اور وہ بالاستیعاب اس کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ اس خط میں جن مولانا کا ذکر ہے وہ یہی خواجہ احمد دین مرحوم ہیں۔

اس خط میں علامہ اقبال لکھتے ہیں:

"آپ کا نوازش نامہ آج صبح مجھے ملا جس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ میری مذہبی معلومات کا دائرہ نہایت محدود ہے، البتہ فرصت کے اوقات میں مَیں اس بات کی کوشش کیا کرتا ہوں کہ ان معلومات میں اضافہ ہو..... اس کے علاوہ ایک اور بات یہ بھی ہے کہ میری عمر زیادہ تر مغربی فلسفے کے مطالعہ میں گزری ہے اور یہ نقطۂ خیال ایک حد تک طبیعت ثانیہ بن گیا ہے۔ دانستہ یا نادانستہ مَیں اسی نقطۂ نگاہ سے حقائق اسلام کا مطالعہ کرتا ہوں۔

"مذکورہ بالا حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے یقین ہے کہ مولوی صاحب موصوف یعنی خواجہ احمد دین کو میرے ساتھ تبادلۂ خیالات کرنے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا، ہاں مجھ کو ان سے فائدہ پہنچنا یقینی ہے، اس واسطے وہ اگر مجھ کو مستفیض کرنے کے ارادے سے امرتسر سے لاہور آنے کی زحمت گوارا فرمائیں تو اُن کی بہت مہربانی ہے جس کے لیے میں اُن کا نہایت شکر گزار ہوں۔ مجھ کو ان کے خیالات سے کسی حد تک پہلے بھی آگاہی ہے کیا اچھا ہو کہ وہ شریعتِ محمدیہ پر ایک مبسوط کتاب تحریر فرمائیں جس میں عادات و معاملات کے متعلق صرف قرآن سے استدلال کیا گیا ہو، معاملات کے متعلق خاص طور پر اس قسم کی کتاب کی آج کل شدید ضرورت ہے۔

اس ضمن میں سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ تھی کہ ملاقات سے پہلے دونوں بزرگوں نے زبانی اور تحریری طور پر نہایت عجز اور انکسار سے کام لیا جیسا کہ اس خط کے اندازِ بیان

سے ظاہر ہے۔ ہر ایک اس بات پر زور دیتا کہ ملاقات کا مقصد دوسرے سے استفادہ کرنا ہے اور بس۔

۶ستمبر ۱۹۲۵ء[کہ] کو علامہ اقبال نے مجھے دوسرا خط لکھا جس میں آپ لکھتے ہیں:

"میں کل شام مولوی صاحب کا منتظر رہا لیکن چونکہ وہ تشریف نہ لائے اس واسطے مجھے اندیشہ ہے کہ میرے خط سے کوئی غلط فہمی نہ ہوئی ہو میں نے آپ کے ارشاد کی تعمیل میں وقت کی تعین اس واسطے نہ کی تھی کہ اس بارے میں مولوی صاحب کی آسائش کو مدّنظر رکھنا ضروری ہے۔ ان کی عنایت کم نہیں کہ وہ محض میرے فائدے کے لیے لاہور تشریف لانے کی زحمت گوارا فرماتے ہیں۔ یہ بات قرینِ انصاف نہیں کہ ان حالات میں میں اپنی سہولت اور اوقات ملحوظ رکھوں، مجھ کو یہ بات اس خط میں واضح کر دینی چاہیے تھی کہ وہ جب چاہیں تشریف لائیں۔ مجھ کو صرف ایک روز پہلے مطلع کریں تاکہ میں ان کی تشریف آوری کے وقت مکان میں ہی رہوں، کہیں اِدھر اُدھر نہ چلا جاؤں۔ آپ کو گزشتہ خط لکھنے کے بعد میں نے چند باتیں نوٹ بھی کر رکھی تھیں جن پر میں مولوی صاحب کے خیالات سے اور ان سے فائدہ اٹھانے کا آرزو مند ہوں۔

مخلص

محمد اقبال

مولوی صاحب کی خدمت میں میری طرف سے سلام عرض کر دیجیے گا۔

علاّمہ کے اس خط کے بعد میں (صوفی تبسم)، خواجہ صاحب کو لاہور لے آیا، اور گڑھی شاہو میں ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی دامر تسری کی قیام گاہ پر

[کہ] علامہ اقبال کے یہ خطوط بنام صوفی تبسم نیشنل لائبریری کراچی میں بھی محفوظ ہیں۔

انہیں ٹھہرا کر علامہ کو اطلاع دینے گیا کہ خواجہ صاحب آگئے ہیں، اجازت ہو تو انہیں آپ کے ہاں لایا جائے۔

علامہ نے فرمایا" وہ تو میرے مہمان ہیں، انہیں دوسری جگہ کیوں اتارا گیا؟ سیدھا یہاں لانا چاہیے تھا۔

چنانچہ میں اُن کی معیّت میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دونوں بزرگوں میں مسلسل چار گھنٹے تک گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ مابعد الطبیعات اور الٰہیات کا شاید ہی کوئی اہم پہلو ایسا ہو جو زیرِ بحث نہ آیا ہو۔

اس آیت "اِنَّ اللّٰہَ یَحُوْلُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِہٖ" پر بہت غامض اور طویل گفتگو ہوتی رہی۔

یہ بابرکت صحبت رات کے ایک بجے ختم ہوئی۔ اس ملاقات کے وقت میرے محترم دوست ڈاکٹر عنایت اللہ بھی موجود تھے، گفتگو کی ابتدا بھی باہمی اظہارِ انکسار سے ہوئی، جس سے سراسر خلوص ٹپکتا تھا۔

میں نے جب ان بزرگوں کے مخلصانہ اندازِ گفتگو کو دیکھا تو مجھ پر ایک رقت طاری ہو گئی اور میری آنکھوں میں محبّت و عقیدت کے آنسو اُبھر آئے اور میرا سر عجز سے خود بخود جھک گیا۔ گفتگو دقیق فلسفیانہ مسائل پر تھی۔ ڈاکٹر صاحب ایک مسئلہ بیان فرماتے اور خواجہ مرحوم اس مسئلے کی تائید میں آیاتِ قرآنی پڑھتے۔

ڈاکٹر صاحب بعض آیات کو نوٹ کر لیتے، ساڑھے تین گھنٹے یا چار گھنٹے کے عرصے میں اثبات وجود باری تعالےٰ، جبر و قدر، خیر و شر، غرض ہر عمیق مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی۔ گفتگو کے اختتام پر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:

مولانا[1] آپ نے قرآن کا مطالعہ اتنی دِقّتِ نظر سے کیا ہے اور اس پر اپنی زندگی کا

---

[1] خواجہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ قرآن مجید میں مولانا کا لفظ صرف اللہ تعالےٰ کی ذات کے لیے خاص ہے، یہ لفظ بندوں کے لیے استعمال نہیں کرنا چاہیے۔

کثیر حصّہ صرف کیا ہے۔ مسلمانوں کی موجودہ مذہبی ضروریات کا بھی آپ کو پورا احساس ہے۔ آپ کو چاہیے کہ اس مطالعہ سے فائدہ اٹھا کر ایک نئی فقہ تیار کریں۔

خواجہ صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں اظہارِ عجز کرتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب آپ کو ماشاء اللہ قرآن اور فلسفۂ جدید دونوں پر عبور حاصل ہے۔ یہ کام آپ ہی کے شایانِ شان ہے۔ غرض یہ بات بھی طے نہ ہو سکی اور معاملہ پھر انکسار کی انتہائی کوششوں میں آکر اُلجھ گیا۔

میرے محترم دوست ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ اور مجھ پر اس گفتگو کا بے حد اثر ہوا۔ مسلسل دو دن تک ہمیں یہ محسوس ہوتا رہا کہ ہم زمین پر نہیں بلکہ عالمِ بالا کی سیر کر رہے ہیں اور آج بھی جب اس ملاقات کا خیال آتا ہے تو ہمارے دل و دماغ پر وہی روحانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ امرتسر سے رسالہ "بلاغ" شائع ہوتا تھا جو کچھ عرصے کے بعد "البیان" کے نام سے نکلنے لگا۔ مولانا محمد حسین عرشی امرتسری اس رسالے کے مدیرِ اعلیٰ تھے۔ اس ماہنامے میں خواجہ احمد دین مرحوم کے مضامین اور قرآن حکیم کی تفسیر باقاعدگی سے شائع ہوتی تھی۔ یہ رسالہ علامہ اقبال صاحب کی خدمت میں باقاعدہ پہنچتا تھا اور وہ اس کا مطالعہ کرتے تھے۔

خواجہ احمد دین امرتسری نہایت ہی پرہیزگار انسان تھے۔ تقویٰ ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ دنیا میں رہتے ہوئے دنیا کی لذتوں سے کنارہ کشی اختیار کرتے تھے۔ وہ اخلاقِ محسنہ کا مجسّمہ تھے۔ ان کی وفات حسرت آیات پر اور کیا کہا جائے کہ

؎ غریباں را دل از بہرِ تو خون است
دلِ خویشاں نمی دانم کہ چون است

علّامہ اقبال اور مولانا محمد حسین عرشی امرتسری

مولانا محمد حسین عرشی مشہور و معروف عالمِ دین، بلند پایہ محقق، صاحبِ طرز ادیب عظیم شاعر اور علامہ اقبال کے ہم عصر تھے۔ میں ابتدائی صفحات میں ان کا تذکرہ کر چکا ہوں۔ امرتسر میں میرے والد کی دکان کے سامنے ان کی زرگری کی دُکان تھی۔ اگرچہ پیشہ زرگری تھا، لیکن اپنے پیشے کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ دکان پر شعر و شاعری اور علم و ادب کی محفلیں جمتی تھیں۔ شعر و ادب سے انہیں فطری لگاؤ تھا۔ جب بھی لاہور تشریف لاتے تو میرے ہاں قیام کرتے۔ میں ان دنوں داتا دربار کے عقب میں ذیلدار روڈ پر رہائش پذیر تھا۔ اکثر علمی ادبی محفلیں یہاں منعقد ہوتی تھیں۔ عرشی صاحب اکثر ان محفلوں میں شریک ہوتے اور ان سے پوری طرح محظوظ ہوتے۔ علامہ اقبال کے کلام سے بھی بہت متاثر تھے۔ جب کوئی کتاب اُردو یا فارسی چھپ کر آتی تو اپنے کام چھوڑ کر گوشۂ خلوت میں بیٹھ جاتے اور اسے ختم کر کے دم لیتے۔ مولانا روم (جلال الدین رومی) سے بھی انہیں شدید رغبت تھی۔ مولانا کی مثنوی کا مطالعہ بار بار کرتے رہتے تھے۔ علامہ اقبال کے کلام خصوصاً بالِ جبریل اور جاوید نامے نے انہیں بے حد مسحور کر دیا تھا۔ علامہ اقبال کے ساتھ اُن کی کافی عرصہ تک قلمی ملاقات رہی لیکن کچھ عرصے کے بعد ہماری وساطت سے علامہ اقبال سے راہ و رسم بڑھتی گئی اور میل ملاقات میں اضافہ ہوتا رہا۔

ایک دفعہ جاوید نامے کے مطالعہ کے سلسلے میں منصور حلاج کے متعلق مندرجات تسلیم کرنے میں انہیں تامل ہوا چنانچہ اس خلش و تامل کا اظہار انہوں نے خط کے ذریعے

کیا۔ میں چونکہ علامہ اقبال کے ہاں اکثر حاضری دیتا تھا۔ میں نے اُن کی اس خلش کا اظہار علامہ اقبال تک پہنچایا۔ علامہ اقبال نے اس مسئلہ کی تشریح فرمائی جو میں نے عرشی صاحب کو پہنچا دی۔ عرشی صاحب نے پھر خط کے ذریعے اظہار خیال کیا اور وہ بات علامہ اقبال تک پہنچا دی گئی۔ علامہ اقبال نے پھر اس کی مزید تشریح فرمائی لیکن عرشی صاحب اس پر مطمئن نہ ہو سکے۔ آخر میں نے سوچا کہ یہ بات رو برو بیٹھ کر ہی صاف ہو سکتی ہے چنانچہ علامہ اقبال سے ان کی ملاقات کا اہتمام کیا گیا۔ اس ملاقات کے بارے میں تفصیل خود عرشی صاحب کی زبانی سُن لیجیے۔

..... کلام حلاج کے بعض حصوں پر دل میں خلش پیدا ہوئی۔ میں نے پروفیسر صوفی تبسم سے اس کا ذکر کیا، انہوں نے لاہور پہنچ کر میری بات علامہ تک پہنچا دی انہوں نے جو کچھ فرمایا مجھے اس وقت یاد نہیں لیکن میں اس پر مطمئن نہ ہو سکا۔ اسی طرح اِدھر سے تردّد اُدھر سے توجیہہ و تشریح ہوتی رہی۔ آخر صوفی صاحب نے کہا۔ یہ بات رو برو بیٹھ کر ہی صاف ہو سکتی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھے اس میں ہچکچاہٹ تھی۔ آخر یہ طے پایا کہ صوفی صاحب میرا تعارف کرائے بغیر یہ مسئلہ چھیڑ دیں گے اور سرسری طور پر اپنے شکوک عرض کر دوں گا چنانچہ ہم چند احباب علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۲ کا واقعہ ہے جبکہ آپ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں مقیم تھے۔ صوفی صاحب نے میرے منشا کے خلاف جاتے ہی میرا تعارف کرا دیا۔ بات شروع ہوئی۔ چھ سات مرتبہ اِدھر سے سوال، اُدھر سے جواب کا سلسلہ چلا۔ آخر میں مَیں نے محسوس کیا کہ وہ اس پر مزید گفتگو کرنا نہیں چاہتے۔ میں نے خاموشی اختیار کر لی۔

وقتاً فوقتاً یہ ملاقاتیں میری وساطت سے ہوتی رہیں اور ان ملاقاتوں کا سلسلہ کافی عرصہ تک قائم رہا۔ میں جب بھی علامہ اقبال کے ہاں جاتا تو مولانا عرشی[1] صاحب کا تذکرہ

---

[1] مولانا محمد حسین عرشی ۴ جون ۱۹۸۵ء کو لاہور میں وفات پا گئے۔ آپ نے خاصی طویل عمر پائی۔ مرتب

چھڑ جاتا۔ جب کبھی عرشی صاحب کو امرتسر سے لاہور آنے میں دیر ہو جاتی تو مجھے کہتے' بہت دن ہوئے مولوی ہو ری نہیں آئے، پھر میں زبانی یا قلمی طور پر یہ پیغام عرشی صاحب کو پہنچا دیتا۔

۱۹۳۵ء کے شروع میں عرشی صاحب ساہی وال کے ایک گاؤں کی تنہائی میں مثنوی مولانا روم کا مطالعہ کر رہے تھے۔ مثنوی میں چند مشکل مقامات آئے جن کے لیے انہوں نے اپنے ارد گرد نگاہ ڈالی تو جاوید نامے کے خالق کے سوا کوئی شخص نظر نہ آیا۔ جو اس راہ کے نشیب و فراز سے واقف ہو، امرتسر پہنچتے ہی علامہ اقبال کی خدمت میں مزاج پرسی کے لیے عریضہ تحریر کیا اور اپنا مدعا بھی ظاہر کیا جس کا چار پانچ دن کے اندر یہ جواب آیا:

لاہور، ۱۹ مارچ ۱۹۳۵ء

جناب عرشی صاحب

السلام علیکم!

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ میری صحتِ عامہ تو بہت بہتر ہو گئی ہے مگر آواز پر ابھی خاطر خواہ اثر نہیں ہوا۔ علاج برقی ایک سال تک جاری رہے گا۔ دو ماہ کے وقفے کے بعد پھر بھوپال جانا ہو گا۔ آپ اسلام اور اس کے حقائق سے لذّت آشنا ہیں۔ مثنوی مولانا روم کے پڑھنے سے اگر قلب میں گرمیٔ شوق پیدا ہو جائے تو اور کیا چاہیے، شوق خود مرشد ہے۔ میں ایک مدت سے مطالعہ کتب ترک کر چکا ہوں، اگر کبھی پڑھتا ہوں تو صرف قرآن یا مثنوی رومی۔ افسوس ہم اچھے زمانے میں پیدا نہ ہوئے۔

؎ کیا غضب ہے کہ اس زمانے میں
ایک بھی صاحبِ سرور نہیں

بہرحال قرآن اور مثنوی کا مطالعہ جاری رکھیے، مجھ سے کبھی کبھی ملتے رہیے، اس واسطے نہیں کہ میں آپ کو کچھ سکھا سکتا ہوں بلکہ اس واسطے کہ ایک ہی قسم کے شوق رکھنے والوں کی صحبت بعض دفعہ ایسے نتائج پیدا کر جاتی ہے جو کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں ہوتے۔ یہ بات زندگی کے پوشیدہ اسرار میں سے ہے جن کو جاننے والے مسلمانانِ ہند کی بدنصیبی سے اب اس ملک میں پیدا نہیں ہوتے، زیادہ کیا عرض کروں۔

محمد اقبال

یہ تھا علامہ اقبال کا عرشی صاحب کے نام پہلا خط جس میں علامہ اقبال کی وسیع القلبی اور صاف گوئی ٹپکتی ہے، ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں :

میں خود بھی عَوْل[1] کی تردید میں بہت دلچسپی رکھتا ہوں۔

ایک صحبت میں عرشی صاحب نے علامہ اقبال سے پوچھا کہ آپ کہتے ہیں :

؎ کیا غضب ہے کہ اس زمانے میں
ایک بھی صاحبِ سُرور نہیں

یہی شکوہ آج سے سات صدی قبل رومی کر رہے ہیں :

؎ دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر
کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست

آخر اس دنیا میں کبھی انسان بستے بھی تھے یا نہیں ؟ علامہ اقبال نے جواب دیا، معیار کا فرق ہوتا ہے۔ پیرِ روم اتنے بلند معیار کا انسان چاہتے تھے جتنے بلند مرتبے کے وہ خود تھے، آج ہم ان کو بھی ترستے ہیں۔

---

[1] مسائلِ وراثت میں ایک حل طلب مسئلہ

ایک مرتبہ عرشی صاحب نے علامہ اقبال کے ہاں بیٹھے ہوئے ایک کاروباری مولوی صاحب کا ذکر کیا کہ ان کے سر پر ایک مخالف فرقے کے نوجوان نے مولیشیوں کے لیے چارہ کاٹنے کا ٹوکا دے مارا جس سے گہرا زخم تو آیا لیکن مولوی صاحب بچ گئے۔ انہوں نے اپنی جماعت میں اس کا بہت پروپیگنڈا کیا۔ علامہ صاحب نے فرمایا: "مرای جاندا تے چنگا سی"۔

علامہ اقبال کی ملاقات کا نشہ اور سرور کئی کئی دن تک رہتا۔ مولانا عرشی ان بزرگوں میں سے ہیں جن کی علامہ اقبال سے عموماً قرآن، اسلام اور تصوف پر باتیں ہوتی رہتی تھیں، کبھی کبھی شعر و شاعری کی بات بھی چھڑ جاتی تھی۔

مولانا محمد حسین عرشی امرتسری کی وضع قطع، بود و باش اور علم و فضل وغیرہ کوئی چیز بھی مولویانہ نہیں تھی اور نہ ہی انہوں نے کبھی اپنے آپ کو اس لقب کا اہل سمجھا، لیکن علامہ اقبال انہیں مولوی کہتے اور اُن کا دیرینہ ملازم علی بخش بھی اندر جا کر یہی کہتا کہ

"امرتسر والے مولوی ہوری آئے نے"۔

دراصل اُس کی وجہ یہ بھی تھی کہ اُن سے علامہ اقبال کی گفتگو عموماً دینی مسائل پر ہوتی تھی، یہ وہ مبارک گھڑیاں ہیں جن کا بدل پھر کبھی نہ مل سکا۔ ان گھڑیوں کو یاد کر کے عرشی صاحب نے بے اختیار یہ شعر پڑھے:

؎ اے ہم نشیں نہ قصۂ بیدادِ عشق چھیڑ
وہ یاد آ گئے تو بھلایا نہ جائے گا

لحد میں جا سوئے یا الٰہی انیس و غم خوار کیسے کیسے
کہ جب کبھی یاد آ گئے ہیں تو پہروں نیندیں اُچٹ گئی ہیں

ایک بار مولانا[1] عرشی صاحب نے علامہ اقبال سے پوچھا۔ "اسلام بتمامہٖ قرآن مجید میں محصور

---

[1] یہ بات عرشی صاحب "پرچہ البیان" دسمبر ۱۹۳۹ء صفحہ ۱۹ پر بھی لکھتے ہیں۔

ہے یا نہیں؟ فرمایا مفصل کہو، انہوں نے کہا خارج از قرآن ذخیرۂ احادیث و روایات اور کتب فقہ وغیرہ کو شامل کر کے اسلام مکمل ہوتا ہے یا صرف قرآن اس بات میں کفایت کرتا ہے؟ علامہ اقبال نے فرمایا۔ یہ چیزیں تاریخ و معاملات پر مشتمل ہیں ان کی بھی ضرورت ہے اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ کن ضروریات کے تحت وضع کی گئیں لیکن نفس اسلام قرآن مجید میں بتمام و کمال آچکا ہے، خداوند تعالےٰ کا منشا دریافت کرنے کے لیے ہمیں قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔

ایک صحبت میں عرشی صاحب نے قرآنِ مجید کی تفسیر کے متعلق پوچھا تو علامہ فرمانے لگے۔ قرآن حکیم کے عجائبات قیامت تک ختم نہیں ہوں گے۔ قرآن مجید کی تفسیر ایک آدمی کے بس کا کام نہیں ہے۔ اس کی تفسیر کے لیے مختلف علوم کے ماہر جو قدیم اور جدید علوم کے مستند ہوں، متفقہ طور پر ایک تفسیر مرتب کریں۔ خصوصی عالم کو اس علم کی متعلقہ آیات تفسیر کے لیے دی جائیں یعنی طبقات الارض کے متعلقہ آیات ماہر طبقات الارض کو تفسیر کے لیے دی جائیں۔ اس طرح متفقہ طور پر ایک تفسیر مرتب کی جائے جو ۱۰۰ سال تک رہے گی۔ ہر صدی کے بعد اس وقت کے علما جدید علوم کی روشنی میں تفسیر پر نظر ثانی کریں اس سے علامہ اقبال کی فکری عظمت اور اُن کی نظر میں قرآن مجید کی شان بلند اور نمایاں ہوتی ہے۔

بلاغ امرتسر مارچ ۱۹۳۴ء کے شمارے میں عرشی صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں:

میں (عرشی) نے شیخ اکبر محی الدین عربی کی خصوص اور اُس کی شروح کو متعدد مرتبہ پڑھا لیکن اُس کا مطلب نہیں سمجھ سکا اور نہ کسی ایسے بزرگ کو پا سکا جو اس کا مفہوم سمجھتا ہو، یہاں تک کہ محترم سر اقبال سے ایک صحبت میں اس کا ذکر ہوا تو انہوں نے بھی یہی فرمایا کہ اس کتاب کا سمجھنے والا کوئی شخص نہیں دیکھا گیا۔

ایک اور صحبت میں علامہ نے فرمایا کہ انسانوں میں حضرت امام حسین رضؓ سے زیادہ

مظلوم کوئی نہیں ہے اور کتابوں میں قرآن مجید سے زیادہ مظلوم کوئی کتاب نہیں ہے جس کو مولوی ..... اور ..... جیسے مفسر میسر آئے۔

علامہ صاحب کے ساتھ ایک اور صحبت کا واقعہ عرشی صاحب نے مجھے خود سنایا جو یوں ہے :

ہنگامہ شہید گنج کے دنوں میں جبکہ مسلمانوں کی مختلف جماعتیں اور اخبارات آپس میں پگڑی اچھالنے کی مشق میں بہت تیزی دکھا رہے تھے، میں نے عرض کیا کہ آپ ان لوگوں کے لیڈروں کو بلا کر صلح کرا دیں تو یہ بڑی اسلامی خدمت ہوگی۔ آپ نے فرمایا امرتسر میں یہ کوشش کرو۔ میں نے کہا امرتسر میں کوئی شخصیت نہیں ہے جو ان پر مؤثر ہو سکے۔ آپ نے فرمایا کہ میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ ان کے مُنہ بند کر سکوں۔ میں ان سب کو خوب جانتا ہوں۔ میں نے کہا آپ کے نزدیک موجودہ ہندی اسلامی تحریکوں میں کون سی تحریک مسلمانوں کے حق میں بہتر ہے۔ آپ نے فرمایا۔ عموماً ان تحریکوں کے قائد جاہل ہیں۔ احرار کے متعلق کہا۔ "ان سے کسی قدر اصلاح کی اُمید ہو سکتی ہے۔"

ایک اور جگہ علامہ اقبال کے متعلق عرشی صاحب رقمطراز ہیں :

"طویل صحبتوں میں رنگا رنگ مسائل پر علامہ اقبال سے تبادلہ خیال ہوتا تھا۔ اُن کی ہر تقریر میرے لیے شافی ہوتی تھی اور کئی دفعہ ایسا بھی ہوا کہ میں نے انہیں کسی خاص مسئلے کی طرف توجہ دلائی جو اس سے پہلے ان کے زیرِ غور نہیں آیا تھا تو انہوں نے میری بات کو توجہ سے سُنا اور تسلیم کیا۔ میری ان کی گفتگو میں بعض باتیں ایسی بھی تھیں جن کی اشاعت سے میں گریز کرنا مناسب سمجھتا ہوں بعض کے متعلق انہوں نے خود بھی فرما دیا کہ اسے شائع نہ کرنا۔

علامہ اقبال کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ ہر شخص سے اس کے ظرف کے مطابق بات کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ کمزور معدے کو قوی غذا مبتلائے مصیبت و مرض کر دے گی انہوں نے اپنی نظم و نثر میں بھی اس کا بہت خیال رکھا ہے۔

علّامہ اقبال اور حکیم فیروزالدین طُغرائی

اُستاذی حکیم الشعرا حکیم فیروزالدین طغرائی ۱۸۸۲ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد میاں شمس الدین کشمیر کے ایک جلیل القدر خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ پشمینہ کی تجارت اُن کا آبائی پیشہ تھا۔ حریفوں اور ہم چشموں میں اُن کی خاص قدر و منزلت تھی اور شہر کے رؤسا میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ لاکھوں روپے کا بیوپار کرتے تھے اور گھر میں دولت کا دریا بہتا تھا۔

حکیم فیروزالدین طغرائی کے بڑے بھائی جوان سے عمر میں بیس سال بڑے تھے، باپ کے لاڈلے تھے۔ والدین نے انہیں ناز و نعمت میں پالا تھا۔ بدقسمتی سے انہوں نے اپنی عیاشی اور لاابالی طبیعت کے باعث باپ کی دولت کو بے دریغ خرچ کیا۔ یہاں تک کہ باپ کی تمام دولت تباہ و برباد کر دی۔ حکیم صاحب والد شمس الدین اس صدمے کو برداشت نہ کر سکے اور اُن کا جلد ہی انتقال ہو گیا۔ اس وقت حکیم صاحب کی عمر ڈیڑھ سال سے بھی کم تھی۔ گھر میں کوئی ایسا صاحبِ ہوش بزرگ نہ تھا جو چھوٹے بچوں کا پُرسانِ حال ہوتا۔ چنانچہ حکیم صاحب نے بچپن ہی سے نامساعد حالات میں پرورش پائی۔ ان کی والدہ بڑی جہاں دیدہ عورت تھیں۔ اُنہوں نے حکیم صاحب کو محلّے کے ایک قاری کے سپُرد کیا تاکہ ان سے دینی تعلیم حاصل کریں۔ اُنہوں نے جلد ہی قرآن حکیم ختم کر لیا اور دینیات کی چند کتابیں بھی پڑھ لیں۔ تحصیلِ علم کا شوق دیکھیے کہ نامساعد حالات اور مالی مشکلات کے باوجود آپ ایک طرف تو رفوگری کا کام کرتے اور دوسری طرف شہر کے

برگزیدہ اصحابِ علم و فضل کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے علم حاصل کرتے۔ آپ نے شہر کے مشہور عالم فاضل استاد شیخ عبدالرزاق خاکی سے یوسف زلیخا جامی اور بہارِ دانش کے کچھ حصے پڑھے۔ شیخ موصوف جب تک زندہ رہے، حکیم صاحب کی قابلیت اور عظمت کا اعتراف کرتے رہے۔ وہ اکثر اپنے اس شاگرد کا ذکر فخریہ انداز میں کیا کرتے تھے۔ درحقیقت یہ ہے کہ حکیم صاحب نے جو کچھ بعد میں اپنے شاگردوں کو پڑھایا۔ شیخ صاحب کی وہاں تک رسائی قطعاً نہ تھی۔ شیخ موصوف کے علاوہ آپ نے منطق، فلسفہ الٰہیات کی کتابیں، شہر کے مشہور و معروف علما و فضلا کی مدد سے پڑھیں اور ان کے علم سے فیض حاصل کیا۔

حکیم طغرائی صاحب اگرچہ اُردو اور فارسی کے مستند شاعر تھے لیکن پنجابی زبان میں بھی خوب شعر کہتے تھے۔ آپ نے پہلی نظم جو لکھی وہ پنجابی میں تھی۔ اس نظم میں آپ نے ملک کے مایۂ ناز پہلوان غلام محمد رستمِ ہند کے دنگل کے واقعات قلمبند کیے۔ اس وقت آپ کی عمر سات آٹھ برس سے زیادہ نہ تھی۔

اُردو شاعری کے ساتھ ساتھ آپ نے فارسی شاعری کا بھی آغاز کیا۔ آپ نے شروع ہی میں تقریباً تمام اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی اور اکثر اساتذہ کی غزلوں پر غزلیں لکھیں، آپ اردو میں فیروز اور فارسی میں طغرائی تخلص کرتے تھے۔ آپ نے علامہ کی بعض خاص نظموں کے جواب میں نظمیں لکھی ہیں جن میں سے کئی اس دور کے سب سے زیادہ مشہور و مقبول روزنامہ "زمیندار" میں قدر و احترام کے ساتھ شائع ہوتی رہیں۔ مولانا ظفر علی خاں ان کی مشقِ سخن اور ذہانت و طباعی کے معترف تھے۔ مولانا حسرت موہانی نے بھی ان کے مجموعہ نظم "کلامِ فیروز" پر تبصرہ کرتے ہوئے انہیں دادِ سخن دی تھی۔ علامہ کی پہلی مثنوی اسرارِ خودی میں خواجہ حافظ کے خلاف لکھے گئے اشعار پر ملک میں ہنگامہ برپا ہوا۔ حافظ کو صوفی سمجھنے والے تصوف کے حامیوں نے بہت کچھ لکھا، حکیم صاحب نے بھی حافظ کی حمایت اور علامہ کی مخالفت میں ایک رسالہ بنام "لسان الغیب"[1] تحریر کیا جو علامہ[2]

---

[1] یہ کتاب شائع ہو چکی ہے۔ مرتب [2] مقالاتِ اقبال سے ماخذ۔ مرتب

کی نظر سے گزرا تو انہوں نے کچھ اس طرح اظہارِ خیال کیا کہ حکیم صاحب میرے مقصد کو نہیں سمجھے۔

علامہ اقبال نے جب نظم "شکوہ" لکھی تو اس وقت کے علما نے علامہ پر شکوے کے خلاف فتوے بھی لگائے۔ حکیم صاحب نے شکوہ اسلام کے عنوان سے اس کا جواب لکھا، جو روزنامہ "زمیندار" میں شائع ہوا۔ حکیم صاحب کی تشبیہات بھی اپنی طبع زاد ہیں اور ان کی مشاقی اور اُستادیٔ فن کا ثبوت ہیں

علامہ اقبال نے نوائے غم اور فلسفۂ غم کے عنوان سے دو نظمیں تحریر کیں جو ان کے کلام بانگِ درا میں ملتی ہیں۔ حکیم صاحب کی نظم نغمۂ غم[1] ستر کے قریب اشعار میں پھیلتی چلی گئی ہے۔ علامہ اقبال کی ایک بہت ہی زوردار اور طویل نظم "تصویرِ درد" ہے جو بانگِ درا کے ۱۲ صفحات میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں ان کی بھرپور جوانی کے بلند آہنگ جذبات بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس نظم کے تتبع میں حکیم فیروز طغرائی صاحب کی نظم "تصویرِ یاس" ان کے کلیات[2] میں دس صفحات پر محیط ہے۔ ان دونوں کے بعض ہم قافیہ اشعار پیشِ خدمت ہیں:

علامہ: نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری

فیروز: نرالے رنگ سے ہنگامہ آرا ہے زباں میری
نیا انداز رکھتی ہے پرانی داستاں میری

علامہ: رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

فیروز: سبق آموز باتیں ہیں سلف کی داستانوں میں
نصیحت خیز ہیں ان کے فسانے سب فسانوں میں

---

[1] حکیم صاحب کی اس نظم میں مسلمانوں کی حالتِ زار کا نقشہ خوب کھینچا گیا ہے۔
[2] کلیاتِ حکیم فیروز الدین طغرائی۔ مرتبہ صوفی مصطفےٰ تبسم

علامہ: ہویدا آج اپنے زخمِ پنہاں کر کے چھوڑوں گا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا

فیروز: عیاں میں آج اپنا سوزِ پنہاں کر کے چھوڑوں گا
جگر کے آبلوں کو آتش افشاں کر کے چھوڑوں گا

علامہ اقبال نے اس زمین میں چھ شعر کہے جبکہ فیروز کے اشعار کی تعداد دس تک پہنچتی ہے۔

نظم جگنو پر علامہ اقبال نے جو تشبیہات مہیا کی ہیں ان کی مثال ملنی مشکل ہے، اس میں ان کی شاعری کمال عروج پر نظر آرہی ہے۔

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسماں سے اُڑ کر کوئی ستارہ
یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں
یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا
غربت میں آکے چمکا گمنام تھا وطن میں
تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا
ذرّہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں
چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی
نکلا کبھی گہن سے، آیا کبھی گہن میں

اس نظم کی آخر تک یہی شان و شوکت ہے۔ جذبات کا ایک دریا ہے جو اُمڈا چلا آرہا ہے۔

اس کے مقابلے میں حکیم فیروز الدین طغرائی صاحب کے جگنو کی چمک دمک ملاحظہ کیجئے:

میر ضامن علی، جلال لکھنوی اور علامہ اقبال ایسی جلیل القدر ہستیاں ہوتی تھیں۔

ان دنوں مولانا شوکت میرٹھی کے تنقیدی مضامین کا بھی بہت چرچا تھا۔ مولانا موصوف کو اپنی علمی قابلیت اور ہمہ دانی پر بہت ناز تھا، کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ بڑے سے بڑے اُستاد کے کلام میں غلطیاں نکالنا اُن کا عام شیوہ تھا اور وہ اپنی اس بے باک عادت پر بے حد نازاں تھے۔ علامہ اقبال کے اشعار پر بھی مولانا نے تنقید کی۔ قبلہ حکیم صاحب نے مسیحا میں اُن کے اُردو اور فارسی کلام پر تنقید شروع کر دی اور اس کو یہیں تک محدود نہ رکھا بلکہ اعتراضات کے ساتھ اشعار کی اصلاح بھی کی جس پر علامہ اقبال نے کہا "ہر فرعونے را موسےٰ"

میرٹھی صاحب سے اس تنقید کا کوئی جواب نہ بن پڑا اور بالآخر خاموش ہو گئے۔

آپ نے ایک رسالہ "ایشیا" بھی جاری کیا۔ اس رسالے میں علمی اور تاریخی مضامین پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ بہت سے مضامین مسلسل ہوتے تھے جن میں ادبی شوخیوں کی بہ نسبت متانت کا رنگ زیادہ ہوتا تھا۔ یہ رسالہ بھی کچھ عرصے کے بعد بند ہو گیا۔

حکیم طغرائی صاحب کے شاگردوں کی تعداد بے شمار ہے اور وہ ملک کے مختلف گوشوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے شاگردوں میں بہت سے ایسے تھے جو بذریعہ خط و کتابت اصلاح لیتے تھے۔ ان شاگردوں میں یہ نام قابل ذکر ہیں: مولانا محمد حسین عرشی، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم (راقم الحروف)، مرزا بیفا خاں بیفا، مرزا شجاع خاں شیون، ڈاکٹر شجاعت احمد تسنیم، چودھری جلال الدین اکبر، حکیم سردار خاں صاحب نشاط، حکیم محمد سکندر خضر، شیخ عبدالقادر ساکر مدراسی، پیرزادہ عبدالعزیز مخدومی، پیر غلام قادر صاحب شوکت، منشی مولا بخش صاحب کشتہ بسمل ہوشیارپوری، منشی مہرالدین صاحب مہر، پنڈت برہم ناتھ قاصر اور حکیم عبدالخالق صاحب مسعود۔

ان شعرا میں راقم الحروف[1] (صوفی تبسم)، کا کلام انجمن شائع ہو چکا ہے۔ مرزا بیفا کا

چمک دمک ہے گلستاں میں جا بجا کیسی
لگا رہی ہے چکا چوند یہ ضیا کیسی
یہ سحر ہے کہ فسوں ہے عجب تماشا ہے
کبھی نظر میں اندھیرا کبھی اُجالا ہے
تلے چراغ اندھیرا جہاں میں ہے مشہور
یہ وہ چراغ ہے رہتا ہے جس کے نیچے نور
بغل میں سوز دروں سے چراغ رکھتا ہے
مگر کسی کی محبّت کا داغ رکھتا ہے
گماں ہے اس پہ دُرِ گوشِ شاہدِ گُل کا
جو یہ نہیں تو شرارہ ہے آہِ بلبل کا
یہ برشگال میں ہم کو نظر پھر آتے ہیں
چراغ پانی پہ قدرت نے پھر جلائے ہیں

ابتدا ہی سے فیروز الدین طُغرائی صاحب کے کلام میں خاصی متانت اور پختگی آ گئی تھی۔ آپ کی طبیعت کی روانی کا یہ عالم تھا کہ ایک طرف تو آپ اردو اور فارسی میں دادِ سخن دیتے اور دوسری طرف پنجابی شعرا کے کلام کی اصلاح بھی فرماتے تھے۔

منشی مولا بخش کُشتہ نے امرتسر سے اُردو کا ایک رسالہ مسیحا کے نام سے جاری کیا۔ کُشتہ صاحب نے شاگرد ہونے کی حیثیت سے اس رسالے کی ادارت کے فرائض حکیم صاحب کے سپرد کیے جن کو انہوں نے بطریق احسن انجام دیا۔ اس رسالے کے ایک ایک حصّے میں ادبی اور تنقیدی مضامین چھپتے تھے اور دوسرے حصے میں طرحیہ غزلیات چھپتی تھیں۔ ہر مہینے ایک نئی طرح دی جاتی تھی اور اس طرح جو کلام مہینے بھر میں موصول ہوتا اُسے رسالے میں شائع کر دیا جاتا تھا۔ اس طرح پر لکھنے والوں میں فصیح الملک نواب مرزا خاں داغ

یدِ بیضا بھی لوگوں سے خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔ جناب شیون مرحوم کی یادگار اُن کی اردو فارسی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ یادگارِ شیون ہے۔

جیسا کہ آپ اُن کے نمونۂ کلام سے دیکھ چکے ہیں کہ حکیم صاحب کا ذوقِ شعر بہت بلند تھا۔ آپ کی نظر اشعار کے اُن محاسن پر پڑتی تھی جہاں اکثر کاملانِ فن نہیں پہنچ سکتے۔ اشعار کی تشریح اتنے بلیغ انداز میں فرماتے کہ ان کے مطالب ہمیشہ کے لیے ذہن نشین ہو جاتے لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ حکیم صاحب کی تمام زندگی مصائب اور مشکلات سے بھرپور رہی۔ اُن کا یہ شعر اُن کی پُراندوہ زندگی کا بہترین آئینہ دار ہے۔

؎ قسمتیں گردشِ دوراں سے پلٹ جاتی ہیں
ایسے قانون بھی منسوخ ہیں میری باری

انہوں نے اپنی زندگی تنگ دستی اور مفلسی میں بسر کی لیکن اس کے باوجود اپنے دوست احباب، عزیز و اقارب اور شاگردوں کو اس بات کی خبر نہ ہونے دی۔ حکیم صاحب کیونکہ مالی مشکلات سے دوچار رہتے تھے اس لیے وہ اپنی اکثر غزلیں شعرا کے ہاتھ فروخت کر دیا کرتے تھے اور اس طرح اپنی گزر اوقات کرتے تھے۔

حکیم صاحب کی قادر الکلامی کا یہ عالم تھا کہ آپ نثر کی نسبت نظم جلد لکھ لیتے تھے۔ طبیعت میں بلا کی روانی تھی۔ آپ کے حُسنِ اخلاق کا یہ عالم تھا کہ جس سے ایک دفعہ ملاقات

لہ صوفی تبسم مرحوم کا کلام انجمن فیروز سنز لمیٹڈ لاہور نے دوبارہ شائع کیا ہے۔ اس کے علاوہ مکتبۂ عالیہ نے غزلیات کا مجموعہ "دامنِ دل" شائع کیا ہے۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد نے صوفی صاحب مرحوم کا ایک مجموعہ "سرشکِ تبسم" شائع کیا ہے اور ایک مجموعہ پنجابی کلام "نظراں کردیاں گلاں" پنجابی ادبی بورڈ نے شائع کیا ہے۔ آپ نے اپنے استاد گرامی طغرائی صاحب کا کلام کلیاتِ طغرائی بھی شائع کروایا اور اس پر دیباچہ بھی خود تحریر کیا ہے۔ مرتب

ہو جاتی۔ عمر بھر اُس سے قطع تعلق نہ کرتے تھے۔ بعض خود غرض احباب کے ہاتھوں آپ کو نقصان پہنچا لیکن آپ نے اپنا رویّہ کبھی نہ بدلا، باوجودیکہ علم و فضل کا مخزن تھے لیکن اپنے علم و فضل کا اظہار کبھی نہ کرتے تھے۔

آپ کی طرزِ زندگی اور مذہبی تحریروں سے یہ بات ثابت ہے کہ آپ ایک روشن خیال اور وسیع المشرب مسلمان تھے۔ عام فرقہ پرست رہنماؤں کے لیے اُن کے دل میں کوئی جگہ نہ تھی۔ سرسیّد مرحوم کی دینی اصلاحات کو تحسین کی نظر سے دیکھتے تھے۔ رسالہ تہذیب الاخلاق میں اُن کے تمام مضامین سرسیّد کے کامل تتبّع کے زبردست شاہد ہیں اور کتاب "برہان القرآن" کا دیباچہ اُن کی دینی بالغ نظری اور دقیقہ رسی کی بیّن دلیل ہے۔ مزید برآں علّامہ اقبال کے معاصرین میں ان کا نام بہت نمایاں ہے۔ حکیم صاحب ایک جامع حیثیات ادیب تھے۔ پنجاب اور بالخصوص امرتسر کی مجالسِ علم و ادب کو ان کی وفات سے جو ناقابلِ تلافی صدمہ پہنچا، وہ اربابِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔

؎ شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا
ایک عالی دماغ تھا نہ رہا

ڈاکٹر سخاء اللہ پسر خواجہ احمد دین امرتسری اور علامہ اقبال

مولوی احمد دین امرتسری کی ڈاکٹر صاحب سے طویل ملاقات کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ مولوی صاحب کے چھوٹے لڑکے سخاء اللہ امرتسر سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے لاہور میں آ گئے تھے۔ یہاں انہوں نے عربی میں ایم اے کیا اور بڑے اعزاز کے ساتھ یونیورسٹی نے انہیں ریسرچ سکالر منتخب کر لیا اور وہ مسلسل تین سال تک اسی کام میں بڑے انہماک کے ساتھ کام کرتے رہے اور اسی تحقیق کے نتیجے میں انہیں بعد میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری بھی مل گئی۔

سخاء اللہ نے بی۔ اے اسلامیہ کالج ریلوے روڈ سے پاس کیا تھا۔ میرے عزیز دوست تاثیر اس زمانے میں وہاں انگریزی پڑھاتے تھے، بڑے جوہر شناس تھے، جہاں موقع ملتا اچھے ہونہار طالب علموں کی حوصلہ افزائی کرتے۔

ایک دن تاثیر نے مجھ سے کہا، صوفی! سخاء اللہ تمہارا برخوردار ہے، بڑا سعادت مند لڑکا ہے۔ اس میں باپ کے سے ہنر ہیں، آج کل پشاور کالج میں عربی کے ایک اُستاد کی اسامی خالی ہے۔ وہاں کا کرتا دھرتا، صاحب زادہ عبدالقیوم ہے۔ وہ ڈاکٹر صاحب کا بے حد معتقد ہے اور انتہائی احترام کرتا ہے۔ تم ڈاکٹر صاحب سے سخاء اللہ کے لیے ایک سفارشی چٹھی لے دو، سخاء اللہ بڑا مستحق ہے۔

میں نے کہا، تاثیر، ڈاکٹر صاحب سے تمہارے زیادہ مراسم ہیں، تم کیوں یہ کام نہیں کرتے؟

تاثیر نے کہا۔ "ٹھیک ہے، لیکن جانتا ہوں ڈاکٹر صاحب کو تمہاری بات کا زیادہ پاس ہوگا، میں تمہارے ہمراہ چلوں گا، سلسلہ جنبانی تم کرنا۔"

اسی دن شام کو ہم دونوں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں پہنچے۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر درمیان میں اچانک یونیورسٹی کے نصاب فارسی کا ذکر آگیا۔ میں نے اس کے فرسودہ ہونے کی شکایت کی۔ فرمانے لگے:

"یہ لوگ لکیر کے فقیر ہیں، ان میں ذوق کی کمی ہے اور محنت سے جی چراتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے میں نے نصاب کمیٹی کو ادھر توجہ دلائی تھی۔ چنانچہ میرے کہنے پر بی اے کے نصاب میں بیدل اور مولانا روم کو شامل کیا گیا تھا۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہمارے طلبا کو ان دو عظیم شاعروں سے محروم رکھا گیا۔

میرا تو عقیدہ ہے کہ ادب کے بغیر انسان میں شائستگی اور تہذیب کا رنگ نہیں اُبھرتا۔ ہم کتنے خوش نصیب ہیں کہ ایک طرف ہمارا فارسی ادب ہے کہ سعدی، خسرو اور نظامی جیسے جلیل القدر مفکروں کے افکار سے مالا مال ہے۔ تصوف میں حضرت علی ہجویری، سنائی اور رومی ہیں۔ ان کی اخلاقی اقدار پر نظر ڈالیں تو ان کا جواب دنیائے ادب میں کم ملتا ہے۔ دوسری طرف عربی زبان ہے، وہ ہماری تاریخ اور علوم دینیہ کا سرچشمہ ہے۔

عربی کا لفظ سنتے ہی تاثیر فوراً بول اُٹھے، مجھے پشاور کالج میں عربی تعلیم کے اہتمام کو دیکھ کر بڑی خوشی ہے۔

میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر عرض کیا:

ہاں ڈاکٹر صاحب! آپ کا قطع کلام ہوتا ہے، مجھے یاد آیا، مولوی احمد دین صاحب کے چھوٹے لڑکے سخاء اللہ عربی کے ایم۔ اے ہیں، انہوں نے پشاور کی اسامی کے لیے درخواست دی ہے، خیال تھا آپ صاحبزادہ عبدالقیوم کے لیے کوئی رقعہ لکھ دیتے تو اس کا کام بن جاتا۔

ڈاکٹر صاحب نے فی الفور جواب دیا، افسوس آپ نے دیر سے بات کی میں نے آج صبح ہی ایک سفارشی خط ان کے نام دیا ہے۔

میں نے عرض کیا، کوئی بات نہیں، ایسی صورت میں آپ کو تکلیف دینا غلط ہوگا۔

ڈاکٹر صاحب حُقّے کے کش لگانے لگے۔ تاثیر نے اور میں نے منہ میں پان ڈال لیے، تھوڑی دیر کے بعد حُقّے کو ایک طرف کر کے بولے: کیا بتایا مولوی صاحب کے لڑکے کا نام؟

میں نے کہا: سخاء اللہ

پوچھا، اس لڑکے کو باپ کی طرح قرآن کے مطالعہ کا بھی شوق ہے؟

بہت شوق ہے، اس لیے مولوی صاحب کو یہ بچہ عزیز بھی ہے۔ انہوں نے خود پڑھایا ہے، مولوی صاحب کا خیال ہے کہ اگر قرآن پاک کو بامعانِ نظر پڑھا جائے تو مطالب کے ساتھ ساتھ انسان کو عربی زبان پر پورا عبور حاصل ہو جاتا ہے۔

تاثیر نے کہا: سخاء اللہ نے مجھ سے بی۔ اے میں انگریزی پڑھی ہے، ماشاء اللہ اسے عربی اور انگریزی دونوں زبانوں میں یکساں قدرت حاصل ہے۔ عالم باپ کا سعادتمند فرزند ہے۔

ڈاکٹر صاحب پھر بولے خوب! اور پھر حُقہ پینے لگ گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد مجھ سے کہا: ذرا علی بخش کو آواز دینا۔

علی بخش آیا۔

ڈاکٹر صاحب بولے: علی بخش! اندر سے خط لکھنے والا پیڈ اور قلم لاؤ اور ہاں ایک لفافہ بھی لانا۔

ڈاکٹر صاحب کچھ وقت کے لیے خط لکھنے میں مصروف ہو گئے۔

فارغ ہوئے تو خط کو لفافے میں ڈالا، بند کیا اور کہا، سخاء اللہ کہاں ہے؟

تاثیر نے کہا: لاہور میں ہے۔

بولے، یہ خط اُسے دے دیجیے، وہ خود صاحبزادے کے پاس لے جائے یا ڈاک میں ڈال دے۔

میں نے لکھ دیا ہے کہ میرے دو مخلص دوستوں نے حاملِ رقعہ کا ذکر کیا، میری رائے میں وہ عربی درس و تدریس کے لیے بے حد موزوں ہے، میرے پہلے خط کو منسوخ سمجھا جائے۔

ان پرانی عقیدت مندیوں اور وضعداریوں کے قربان!

صاحبزادہ عبدالقیوم نے سخاء اللہ کو بغیر کسی مزید انٹرویو کے ملازم رکھا، خواجہ سخاء اللہ نے بھی اپنے ابّا اور اپنی لاج رکھ لی اور ڈاکٹر صاحب کی تحریر کو چار چاند لگا دیے۔

پشاور میں عربی کی تدریس کا نام روشن کیا اور خود اعلیٰ منصب پر پہنچے۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ احسان ہمیشہ ان کے وردِ زبان رہا۔

بدقسمتی سے آج کل وہ[1] فالج کے مریض ہیں اور صاحبِ فراش ہیں ورنہ اس موقع پر ضرور کچھ لکھتے۔

---

[1] آج کل وہ ہمارے درمیان موجود نہیں، وہ وفات پا چکے ہیں۔ مرتب

علّامہ اقبال کے بارے میں ایک تذکرہ

ایک دفعہ میں اور کچھ عزیز و اقارب سیر و تفریح کے لیے کشمیر گئے ہوتے تھے اور سرینگر میں مقیم تھے، ایک ٹانگے والا جو ہمیں روزانہ شام کو سیر کے لیے لے جاتا تھا وہ شام کے وقت نہ آیا۔ ہم اس کا بہت دیر تک انتظار کرتے رہے۔ آخر کار وہ رات کے وقت ہمارے پاس پہنچا اور عرض کی کہ میں معافی کا خواستگار ہوں کہ میں آج شام آپ کے پاس نہ پہنچ سکا اور آپ کا آج کا پروگرام بالکل اکارت گیا۔ ہم نے پوچھا "کیا بات ہوئی، تم خیریت سے تو ہو؟" وہ کہنے لگا میں تو دانت کے درد سے نڈھال ہوں سوچتا ہوں کہ کسی ڈاکٹر کو دکھاؤں تاکہ اس درد سے نجات ملے۔ مجھے فوراً ایک پرانا نسخہ یاد آیا، میں نے کہا، "گھر جا کر تھوڑا سا لہسن لو۔ لہسن کو تھوڑا سا کوٹ کر اس پر نمک اور لونگ لگا دو اور پھر اسے اس جگہ پر رکھ دو جہاں درد ہو رہا ہے۔"

وہ فوراً یہ سُن کر گھر واپس گیا اور یہ نسخہ آزمایا، وہ صبح کے وقت ہشاش بشاش ہمارے پاس پہنچا اور کہا "میں اب بالکل ٹھیک ہوں، یہ آپ کے علاج کا معجزہ ہے۔" میں نے کہا، یہ بہت بڑا نسخہ تھا جو تم نے استعمال کیا ہے۔ یہ وہ نسخہ تھا جسے علامہ اقبال نے بھی آزمایا تھا۔ چنانچہ ہم نے یہ قصّہ اُسے یوں سُنایا:

ایک دفعہ علامہ اقبال دہلی میں حکیم اجمل صاحب کے پاس ٹھہرے۔ وہ دہلی میں اکثر اُن کے ہاں قیام فرمایا کرتے تھے۔ رات کے وقت جب حکیم صاحب تخلیے میں چلے گئے اور ڈاکٹر صاحب اپنے کمرے میں آرام فرمانے لگے تو دانت کے درد نے انہیں آگھیرا

وہ درد سے تڑپنے لگے۔ حکیم صاحب کا ایک خادم جو وہاں موجود تھا، ڈاکٹر صاحب کی حالت دیکھ کر بہت پریشان ہوا۔ آدھی رات کا وقت تھا اور حکیم صاحب آرام فرما رہے تھے۔ حکیم صاحب کا خادم بہت تذبذب میں تھا کہ حکیم صاحب کو کیسے بلایا جائے، لیکن ڈاکٹر صاحب کے مسلسل اصرار اور اُن کو درد سے نڈھال دیکھ کر اُس نے حکیم صاحب کو بلانے کی ٹھانی، حکیم صاحب کی خدمت میں جا کر ڈاکٹر صاحب کی تمام کیفیت بیان کی۔ حکیم صاحب فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے اور ڈاکٹر صاحب کے پاس آئے اور پوچھا کہ کیا بات ہوئی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تو آپ کی طبیعت بالکل ٹھیک تھی، یہ درد کیسے شروع ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے عرض کیا کہ میں تو اچانک دانت کے درد سے نڈھال ہو گیا ہوں، میرا کوئی فوری علاج کیجیے جس سے میں ٹھیک ہو جاؤں۔ حکیم صاحب نے یہ کیفیت دیکھی اور کہا چند منٹ انتظار کریں، میں اندر سے آپ کے لیے دوائی لاتا ہوں۔

حکیم صاحب اندر گئے اور دوائی تیار کر کے ڈاکٹر صاحب کے لیے لے آئے۔ ڈاکٹر صاحب کے جس دانت میں درد ہو رہا تھا، وہاں وہ دوائی رکھ دی اور ڈاکٹر صاحب کو کہا کہ آپ اب آرام کریں۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ بالکل تندرست ہو جائیں گے، فکرمند ہونے کی کوئی بات نہیں۔ دوائی لگا کر حکیم صاحب چلے گئے اور ڈاکٹر صاحب آرام فرمانے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر صاحب کی بے چینی ختم ہوئی اور درد میں کمی ہونی شروع ہوئی۔ صبح کے وقت جب ڈاکٹر صاحب بیدار ہوئے تو وہ بالکل تندرست تھے۔ حکیم صاحب صبح تشریف لائے اور ڈاکٹر صاحب سے کیفیت دریافت کی تو انہوں نے نہایت ہشاش بشاش لہجے میں حکیم صاحب سے پوچھا "حکیم صاحب یہ کونسا نسخہ تھا جو آپ نے اس درد کے لیے استعمال کیا ہے۔ یہ تو تیر بہدف علاج ہے، میں تو فوراً ٹھیک ہو گیا ہوں اور میری طبیعت اب ہشاش بشاش ہے۔"

حکیم صاحب نے جواب دیا کہ یہ وہی نسخہ ہے جو ہمارے دادا نے نادر شاہ کو اسی

تکلیف کی حالت میں دیا تھا، وہ اُس وقت شاہی حکیم تھے۔ نادر شاہ کو بھی یہی دانت کا سخت درد ہوا تھا، جبکہ دِلّی کی خوشی میں جشن منا رہا تھا۔ وہ اس درد سے بہت نڈھال تھا لیکن اس دوا سے فوراً ٹھیک ہو گیا۔ اُس نے بھی اس نسخے کے متعلق استفسار کیا تھا لیکن ہمارے دادا نے جو بہت بڑے طبیب تھے، انہیں بتانے سے انکار کر دیا تھا، حالانکہ یہ ایک معمولی سا نسخہ ہے لیکن اب جبکہ آپ پوچھ رہے ہیں اور آپ کی ذات گرامی کے سامنے کسی کو انکار کی مجال نہیں، اس لیے آپ کو ہم یہ نسخہ بتا رہے ہیں۔

نسخہ بتانے کے لیے وہ یوں گویا ہوئے :

"یہ کوئی نایاب دوائی نہیں، میں نے اندر جا کر تھوڑا سا لہسن لیا اور اسے ذرا کوٹ کر اس پر نمک اور لونگ لگا کر آپ کے پاس لے آیا اور دانت پر جہاں درد ہو رہا تھا وہاں رکھ دیا۔ یہ کوئی نادر دوائی نہیں تھی اور نہ کوئی میرا ذاتی معجزہ تھا، باقی شفا اللہ تعالےٰ کے ہاتھ میں ہے"۔ ڈاکٹر صاحب یہ بات سُن کر حیران و ششدر رہ گئے اور حکیم صاحب کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔

علّامہ اقبال کے ساتھ چند اہم ملاقاتیں

ایک ملاقات میں باتوں باتوں میں کہنے لگے۔ میں جرمنی میں تھا۔ ایک دن شام سے پہلے میں سیر کے لیے نکلا۔ میرے سر پر ترکی ٹوپی تھی۔ اچانک ایک جرمن میرے سامنے آیا اور سلام کیا۔ میں نے سلام کا جواب دیا۔ اُس نے کہا۔ آپ مسلمان ہیں؟ میں نے کہا جی میں مسلمان ہوں۔ بولا میں بھی مسلمان ہوں، کچھ عرصہ ہوا میں نے اسلام قبول کیا ہے۔ قرآن پڑھ کر نماز کے کچھ خد و خال تو میرے ذہن میں آ گئے ہیں لیکن اس کی پوری صورت سمجھ میں نہیں آتی، کیا ازراہِ کرم آپ مجھے بتا سکیں گے؟

میں نے کہا کیوں نہیں، یہ میرا فرض ہے لیکن اس کے لیے آپ کو میرے ہمراہ میرے گھر تک جانا ہوگا۔ وہ رضامند ہو گیا اور میں اسے ہمراہ لے آیا۔ اپنے کمرے میں بٹھا کر میں نے بوٹ اتارا، جرابیں اتاریں، کوٹ اور ٹوپی اتاری اور پورے طریقے سے وضو کیا اور نماز ادا کی۔ وہ بڑے غور سے دیکھتا رہا اور اس دوران میں اُس نے کچھ چیزیں کاغذ پر نوٹ بھی کیں، میں نے نماز کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو وہ بھی دعا میں شریک ہوا۔ اس کے چہرے پر طمانیت کے آثار نمایاں تھے۔ ایسے محسوس ہوتا تھا کہ جیسے یہ نماز صرف میں نے نہیں پڑھی، اُس نے بھی پڑھی ہے۔

اُس نے میرا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میں نے خود قرآن شریف پڑھ کر اسلام قبول کیا ہے۔ یہاں میری رہنمائی کرنے والا کوئی نہیں۔ خود ہی اس کا مطالعہ کر کے اپنی سمجھ کے مطابق عمل کرتا ہوں۔ اس وقت نماز کے سلسلے میں بعض باتیں وضاحت طلب

ہیں۔ اگر آپ بتا سکیں تو میں آپ کا بے حد ممنون ہوں گا۔

کہنے لگا، آپ ہمارے ملک کی آب و ہوا سے واقف ہیں، ہمارا لباس یورپین ہے۔ اس کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ نماز کی بعض حرکات اس لباس کے باعث پوری طرح ادا نہیں ہوتیں۔ بالخصوص زمین پر اطمینان سے بیٹھ کر سجدہ کرنے میں دقت محسوس ہوتی ہے۔ اس سے انسان کے ذہنی سکون میں خلل آجاتا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ میں کرسی پر بیٹھ جایا کروں، سامنے میز ہو، رکوع کے وقت نیم خمیدہ ہو جاؤں اور سجدے کے وقت میز پر سر رکھ دوں تاکہ میری طمانیتِ قلب قائم رہے۔

میں نے کہا بالکل صحیح ہے، رکوع و سجود خدا کے حضور انسان کے اظہارِ نیازمندی کے لیے ہے۔ اس کا تعلق جسم سے زیادہ قلب سے ہے۔

میں نے دیکھا ہے کہ تمہارا قلب صالح ہے اس لیے جس طرح بھی سجدہ کرو گے درست ہوگا۔ اسلام کی تعلیم کی رُوح اسی میں مضمر ہے۔

یہ سُن کر اس کے چہرے پر بشاشت کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے میرا دوبارہ شکریہ ادا کیا اور کہا:

اگر آپ اجازت دیں تو کبھی کبھی کسی مسئلے پر مزید وضاحت کی ضرورت کے تحت حاضر ہو جایا کروں۔

میں نے کہا، کیوں نہیں جب بھی آپ چاہیں تشریف لا سکتے ہیں۔

گورنمنٹ کالج لاہور میں مَیں دیوانِ[1] غالب پڑھاتا تھا۔ صبح سیر کو جانے لگا تو خیال آیا جو غزل پڑھانی ہے ذرا اس پر ایک نظر ڈال لوں، دیوان کھولا، زیرِ مطالعہ آنے والی غزل کا مطلع یہ تھا:

---

[1] صوفی صاحب مرحوم ایک طویل عرصے تک بی۔ اے کلاسوں کو دیوانِ غالب پڑھاتے رہے۔ دیوانِ غالب پڑھانے میں وہ بہت دلچسپی لیتے تھے۔ بعض اوقات دو شعروں کی تشریح میں ہی پیریڈ ختم ہو جاتا تھا۔ مرتب

شبنم بہ گل لالہ نہ خالی زادا ہے
داغ دل بے درد نظرگاہ حیا ہے

آگے نظر دوڑائی تو یہ شعر نظر پڑا :

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگر سوختہ کیا ہے

مَیں اور میرے رفقا نے اقبال کے اشعار تو درکنار کبھی کسی اور شعر کے مفہوم پوچھنے کی جسارت نہیں کی تھی لیکن نہ جانے کیوں، اُس روز معاً خیال ڈاکٹر صاحب کی طرف گیا۔ سوچا انہی کی خدمت میں چلوں، اس شعر کی وضاحت بھی ہو جائے گی۔ سائیکل اٹھائی اور باغِ جناح (جو اُن دنوں ہماری مظلوم غلامی کے باعث لارنس گارڈن کہلاتا تھا) میں پہنچا۔ کچھ پیدل گھومتا رہا اور پھر سائیکل پہ سوار ہو کر میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں پہنچا۔ صبح کا سہانا وقت تھا اور موسم خوشگوار، ڈاکٹر صاحب کوٹھی کے باہر چبوترے پر تنہا اپنے بستر میں لیٹے ہوئے حُقّہ پی رہے تھے۔ چہرے پر کچھ غیر معمولی بشاشت تھی۔ میں نے سلام عرض کیا۔ سلام کا جواب دیتے ہی فرمایا :

آؤ صوفی صاحب، صبح سویرے کیسے آئے؟

میں نے کہا غالبؔ کے ایک شعر کے معنی پوچھنے آیا ہوں۔

بولے، واہ آپ دن رات غالبؔ پڑھتے پڑھاتے ہیں، مجھ سے کیا پوچھتے ہیں؟

حضور ایک شعر ایسا ہی آگیا ہے۔

(قدرے تعجب سے)

کون سا شعر؟

مَیں نے کہا: قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

بولے اس شعر کی تشریح تو میں نے جاوید نامے میں کی ہے۔ میں نے عرض کی، اس لیے تو میں حاضر ہوا ہوں، ذہن میں کچھ اُلجھنیں ہیں۔

فرمایا، اُلجھنیں؟ میرے تشریحی شعر یاد ہیں؟

نہیں۔

جاوید نامہ ہے؟

نہیں۔

اچھا تو ذرا علی بخش کو آواز دیجیے۔

علی بخش حاضر ہوا اور پھر ڈاکٹر صاحب کے حکم کے مطابق کمرے میں سے جاوید نامہ کی جلد اُٹھا لایا۔

کتاب میرے سپرد کی گئی۔ میں نے وہ صفحہ نکالا جہاں غالب کی زبان سے اس شعر کی تشریح درج تھی۔

فرمایا، پڑھیے۔

میں نے حسبِ ارشاد کتاب اٹھائی اور کھڑا ہو کر دست بستہ عرض کیا:

قبلہ ڈاکٹر صاحب ہے تو گستاخی لیکن چاہتا ہوں آپ یہ اشعار خود ہی پڑھیں

اس پر انہوں نے میری طرف ایک عجب انداز سے دیکھا اور فرمایا، میں پڑھوں! اچھا بیٹھو، میں پڑھتا ہوں۔

یہ ان کی پھر غیر معمولی شفقت تھی۔ انہوں نے یہ اشعار پڑھے:

نالۂ کو خیزد از سوزِ جگر
ہر کجا تاثیرِ او دیدم دِگر
قمری از تاثیرِ او واسوختہ
بُلبل از وے رنگہا اندوختہ

اندرو مرگے باآغوشِ حیات
یک نفس اینجا حیات، آنجا ممات!
آنچناں رنگے کہ اثر رنگی از اوست
آنچناں رنگے کہ بے رنگی ازوست
تو ندانی ایں مقامِ رنگ و بوست
قسمتِ ہر دل بقدرِ ہائے و ہوست
یا برنگ آ، یا بہ بے رنگی گزر
تا نشانے گیری از سوزِ جگر

اُن کے پڑھنے کا انداز ایسا تھا کہ بات میری سمجھ میں آگئی۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور پھر گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا۔

ڈاکٹر صاحب! گستاخی معاف، پونے آٹھ بج چکے ہیں، مجھے کالج پہنچنا ہے۔ آٹھ بجے میری کلاس ہے۔ یہ کہہ کر میں ایک طرح خلافِ آداب اُٹھا، سائیکل پہ بیٹھا اور سلام کہہ کر چل دیا۔

دوپہر کو کالج سے فارغ ہوا، گھر آیا، کھانا کھایا، کچھ دیر سستانے کے بعد اُن کی خدمت میں پہنچا، وہ حسنِ اتفاق سے پھر تنہا بیٹھے تھے اور حسبِ معمول حُقّہ پی رہے تھے، میں نے نیازمندانہ انداز میں سلام کیا اور عرض کیا :

ڈاکٹر صاحب! معافی چاہتا ہوں، صبح میں کالج میں کام کے باعث اُٹھ کر چلا گیا آپ میری اس غیر معمولی اور گستاخانہ حرکت پر حیران ہوئے ہوں گے۔

ہاں، میں بھی سوچتا رہا کہ آپ نے غالب کے شعر کے بارے میں اتنا تردّد کیا اور پھر اچانک چل دیے۔

میں نے کہا، شعر میں کچھ اُلجھنیں تھیں، وہ آپ کے اشعار پڑھنے کے انداز سے

رفع ہو گئیں ۔

اچھا.... ٹھیک ۔

جی !

وہ چپ ہو گئے اور حقّہ کی نے چھوڑ کر یوں دیکھنے لگے جیسے کچھ سوچ رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا :

ڈاکٹر صاحب! مرزا غالب کے بعض احباب اور شاگرد اُن کے مشکل اشعار کے سلسلے میں اُن سے وضاحت طلب کرتے رہتے تھے اور وہ جواب میں اُن کی ذہنی سطح کے مطابق کبھی تفصیل اور کبھی اجمال کے ساتھ، مشکلات کی وضاحت کیا کرتے تھے۔ اب کچھ عرصے سے لوگوں میں غالب کے کلام کے مطالعہ کا شوق بڑھ رہا ہے اور اس ضمن میں شرحیں بھی لکھی گئی ہیں۔ سب تو نہیں لیکن بعض شرحیں ہیں اُن میں کہیں کہیں ایسے اشعار بھی آجاتے ہیں جن کی تشریح مرزا غالب کی اپنی توضیحات سے مختلف ہیں لیکن بے حد معقول ہیں تو کیا یہ مناسب ہے یا ممکن ہے ؟

ڈاکٹر صاحب : بالکل، کیوں نہیں، ایک بڑے شاعر کے سلسلے میں ..... آپ سمجھتے ہیں نا، بڑا شاعر کون ہوتا ہے ؟

جی میں سمجھتا ہوں ۔

مرزا غالب بہت بڑا شاعر تھا۔ اُس کے اشعار میں گہرائی اور وسعت تھی۔ تہ دار شعر کہتا تھا۔ زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس کے اشعار کے یہ بظاہر معانی اب اُبھر رہے ہیں اور بالغ نظر لوگوں کے ذہن میں آ رہے ہیں ۔

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔ حُقّے کے ایک دو کش لگانے کے بعد فرمانے لگے :

لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ غالب کے ذہن میں یہ معانی نہ تھے۔ وقت اور ضرورت کے مطابق کچھ معانی اُن کے شعور میں ہوتے جنہیں وہ پوچھنے پر بیان کر دیتے، باقی معانی

ان کے تحت شعور میں ہوتے تھے۔ یہ تو اُن کا اپنا تجربہ تھا، یہ مطالب اُن سے کیسے اوجھل ہو سکتے ہیں۔

میں نے عرض کیا : بجا ہے۔

وہ پھر خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد کہا :

آپ کو معلوم ہی ہے، کبھی کبھی کچھ لوگ رسول اکرمؐ کی خدمت میں آکر قرآن مجید کی بعض آیات کے بارے میں استفسارات کیا کرتے تھے۔ باوجود اس کے کہ قرآن مبین اُن لوگوں کی اپنی مادری زبان میں تھا لیکن پھر بھی بعض مقامات اُن کے ذہن میں واضح نہیں تھے۔ چنانچہ رسول اکرمؐ وقت اور ضرورت کے مطابق تفسیر بیان کر دیتے تھے۔ صدیوں بعد ہمارے چوٹی کے علما نے تفسیریں لکھیں۔ ان تفسیروں میں بعض ایسے مطالب بھی آئے جو رسول اکرمؐ کے فرمودات سے قدرے مختلف تھے، لیکن یہاں بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مطالب آنحضرتؐ سے پوشیدہ تھے۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ قرآن پاک تو ان پر نازل ہوا تھا، ان کا روحانی تجربہ تھا لیکن وہ موقع اور حالات کے مطابق معانی بیان کر دیتے تھے ورنہ کلام پاک کا ہر معنوی گوشہ اُن کے تحت شعور میں موجود تھا۔ یہ بات ثابت کرتی ہے کہ قرآن حکیم ہر زمانے میں ہماری ضروریات اور مقتضیات کے لیے مکتفی ہے۔ پھر تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئے اور فرمایا :

مَیں ان معنوں میں کہ رسول پاکؐ ان معنوں سے واقف تھے، اُنہیں عالم الغیب سمجھتا ہوں۔

ہم چند دوست بیٹھے ہوئے علامہ اقبال سے ولایت کی باتیں کر رہے تھے۔ گفتگو کا سلسلہ تو ہم پرستی تک آ پہنچا۔

ہم میں سے ایک نے کہا، ڈاکٹر صاحب! وہ لوگ تو ان توہمات سے پاک ہوں گے۔

ڈاکٹر صاحب بولے :

"اونہہ اونہہ، یہ نہ کہو، وہ لوگ جتنے پڑھے لکھے ہیں، اُتنے ہی اس بارے میں جاہل بھی ہیں۔

میں جب لندن میں تھا تو میں بورڈنگ کی بجائے ایک خاندان کے یہاں اُجرتی مہمان تھا۔

یہ ایک چھوٹا سا گھرانہ تھا۔ میاں بیوی اور دو بچیاں۔ سبھی پڑھے لکھے تھے۔ میاں پروفیسر تھے، بیوی کسی بڑے آفس میں ملازم اور بچیاں کالج میں اعلیٰ تعلیم پا رہی تھیں۔

شروع شروع میں انگریزی آداب و رسوم کے مطابق کچھ تکلفات رہے، رفتہ رفتہ راہ و رسم بڑھی۔

شام کے بعد ہم لوگ اکثر نشست کے کمرے میں بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے۔ لڑکیوں کو میری فلسفیانہ گفتگو بہت پسند تھی، وہ اکثر سوال پوچھتی رہتیں۔

ایک دن میں نے اچانک اُنہیں ٹوکا اور کہا :

تم ہمیشہ میری ہر بات کا کھوج نکالتی رہتی ہو، لیکن تمہاری اپنی حالت یہ ہے کہ تم نے اپنے گھر کی بعض چیزیں ابھی تک مجھ سے چھُپا کر رکھی ہوئی ہیں۔ وہ حیران ہو کر بولیں:

یہ آپ کیسے کہتے ہیں؛ اب تو آپ ہمارے خاندان کے ایک فرد کی طرح ہیں، آپ سے ہم کیسے کوئی چیز چھپانے لگے۔

مَیں نے کہا، نہیں دیکھو، تم نے اپنے مکان کا ایک کمرہ بند رکھا ہوا ہے اور مجھے کبھی یہ نہیں بتایا کہ اُس میں کیا ہے؟

بولیں، توبہ! توبہ یہ بات نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم خود بھی اس کمرے میں نہیں جاتیں۔ اُس کمرے میں آسیب ہے۔ اس میں قدم رکھنا تو درکنار ہم تو اس کی دیوار کے سایے سے بچ کر گزرتی ہیں۔

میں نے بڑی متانت سے کہا :

"اوہو، تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا، میں اپنے فلسفے کے زور سے آسیب اُتار سکتا ہوں۔

پہلے تو انہیں یقین نہ آیا۔

پھر میری انتہائی متانت سے متاثر ہوئیں اور کہنے لگیں :

آپ یہ کیسے کریں گے ؟

میں نے کہا :

پہلے مجھے کمرہ کھول کر دکھاؤ۔

یہ کٹھن کام تھا لیکن وہ مجبور ہو گئیں۔

کمرہ کھولا گیا۔

یہ کمرہ ساز و سامان سے آراستہ تھا۔

میں نے کہا :

واہ! آپ نے میرے کمرے سے زیادہ اسے بنا سنوار کے رکھا ہے۔ یوں آپ اتنی محبت کا اظہار کرتی ہیں۔

کہنے لگیں، یہ بات نہیں، آپ تو ہمارے عزیز ہوئے نا اور اس آسیب کی خاطر مدارات اس لیے کرتی ہیں کہ ڈر لگتا ہے کہیں خفا نہ ہو جائے۔

میں اندر جانا چاہتا تھا لیکن وہ دونوں بہنیں زور سے میرے بازو پکڑے ہوئے کھڑی رہیں۔

میں نے ظاہراً کچھ پڑھا۔

دروازہ پھر مقفّل کر دیا گیا۔

وہ دونوں سخت پریشان تھیں۔

بار بار رو پڑتیں۔

انہیں میری جان کا خطرہ تھا۔

دوسرے دن وہ کسی لاٹ پادری سے تعویذ لے کر آئیں اور مجھے پہنا دیا اور مَیں نے ان کی خوشنودی کی خاطر اُسے گلے سے لگائے رکھا۔

وقت گزرتا چلا گیا۔

ایک دن سوء اتفاق سے وہ تعویذ کموڈ میں گر کر ضائع ہو گیا۔

مَیں سخت پریشان تھا۔

سوچتا تھا کہ کیا جواب دوں۔

آخر ایک تجویز سوجھی۔

مَیں نے اُن سے کہا:

"دیکھو، مَیں نے تمہیں بتایا نہیں۔ تمہارے تعویذ سے آسیب بہت تنگ آیا ہوا تھا۔ راتوں کو بار بار آ کر منت سماجت کرتا تھا کہ یہ تعویذ اتار دو، مجھے سخت تکلیف ہو رہی ہے۔

آخر مَیں نے اُس سے کہا:

مَیں تعویذ اتار دیتا ہوں بشرطیکہ تم اس گھر سے نکل جاؤ۔

وہ وعدے کے مطابق چلا گیا ہے اور میں نے اُس کے کہنے پر تعویذ کو ایک جگہ چھپا دیا ہے، اب تم دروازہ کھول دو، کوئی خطرہ نہیں۔

کمرہ کھول دیا گیا لیکن میرے اصرار کے باوجود وہ لڑکیاں اس میں نہیں جاتی تھیں اور میں اکثر اس کمرے میں بیٹھ کر آرام سے مطالعہ کیا کرتا تھا۔

یہ سُن کر ہم سب مسکرائے۔

اور اُنہوں نے کہا، ایک اور واقعہ سُناتا ہوں۔

میں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے سلسلے میں لندن میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اتوار کی صبح کو مَیں اپنے بستر میں چین سے لیٹا تھا کہ نوکر نے آکر کہا:

"جناب ایک بوڑھی ضعیف خاتون آپ سے ملنا چاہتی ہیں"۔

میں نے ٹالنے کی کوشش کی لیکن وہ بضد تھیں، آخر میں نے انہیں بُلا لیا۔

وہ آکر میرے سامنے یوں بیٹھ گئیں جیسے کسی مقدس دیوی کے حضور کوئی پجارن بیٹھی ہو۔

مجھ سے کہنے لگیں:

"آپ ایک بزرگ ہستی ہیں، روحانیت کا مجسمہ، آپ سے میری التجا ہے کہ آپ میرے مستقبل کے بارے میں کچھ بتائیں۔

مَیں نے لاکھ سمجھایا کہ میں ہرگز اس قابل نہیں ہوں لیکن وہ نہ مانیں۔

مَیں نے دیکھا میرے بار بار انکار کرنے سے اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں۔

مَیں نے اُس کی دلجمعی کی خاطر کہا:

اپنا ہاتھ مجھے دکھائیے۔

اُس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔

مَیں دیر تک اُس کے ہاتھ کو دیکھتا رہا اور کہا۔ میں صرف ایک ہی بات بتاؤں گا اور کچھ نہیں۔

وہ راضی ہو گئی۔

مَیں نے کہا، آپ کا اور میرا ہاتھ ایک جیسا ہے اور پتہ چلتا ہے کہ آپ اور مَیں ایک ہی دن دُنیا سے رخصت ہوں گے۔

یہ سُن کر بُڑھیا کا چہرہ خوشی سے تمتما اُٹھا اور وہ مجھے دعائیں دیتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

علّامہ اقبال سے آخری ملاقاتیں

ایک دن میں تنہا اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ایک عرصے سے وہ صاحبِ فراش تھے لیکن اُس روز وہ کچھ غیر معمولی طور پر مضمحل نظر آئے۔ مَیں بھی خاموش بیٹھا رہا، اچانک اُنھوں نے میری طرف رُخ کیا اور فرمایا، صوفی صاحب! کوئی ایسا نوجوان لڑکا ہے جو مجھے بغیر ساز کے خوش الحانی کے ساتھ شعر سُنائے؟ میں نے فوراً جواب دیا، جی ہاں ہے۔

ہے؟ انہوں نے یہ لفظ کچھ اس انداز سے کہا کہ میرا دل سینے میں دھڑکنے لگا۔

پھر ذرا سنبھل کر میں نے عرض کیا:

یقیناً ہے۔

کون ہے؟

میرا ایک شاگرد ہے۔

وہ تو میں سمجھتا ہوں، لیکن وہ یہاں آسکتا ہے؟

کیوں نہیں، آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کو اپنی سعادت سمجھے گا۔ مدت ہوئی فارغ التحصیل ہو چکا ہے۔ ایک دفتر میں ملازم ہے۔ آپ اجازت دیں تو میں ابھی جاکر اُس سے مل لوں۔

فرمایا، تو جائیے۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ میں تیزی سے سائیکل چلاتا ہوا سراج نظامی سے جاکر ملا۔ وہ اُس زمانے میں الیکشن کمشنر کے دفتر میں کام کرتا تھا۔ اس کا دفتر کورٹ سٹریٹ

میں تھا جو پنجاب سیکرٹریٹ کے پہلو میں واقع ہے۔ سراج نظامی کام سے فارغ ہو کر جانے ہی والا تھا۔ میں نے ساری کیفیت سنائی اور کہا آؤ، چائے پیئیں اور ڈاکٹر صاحب کی طرف چلیں، وہ شعر سننے کے لیے بے تاب ہیں۔

بولا، یہ میری خوش بختی ہے لیکن مجھے آج ایک ضروری کام ہے، کل چلوں گا۔

میں نے کہا سراج! یہ تمہارا عام بہانہ ہے، آج تم اتفاق سے قابو آ گئے ہو، کیا خبر کل کہاں ہو گے۔

سراج نظامی صاحبِ ذوق نوجوان تھا اور درد مند دل رکھتا تھا لیکن تھا لاابالی مگر ڈاکٹر صاحب کا معاملہ تھا، کہنے لگا، صوفی صاحب! قبلہ حضرت اقبال سے میری عقیدت کا آپ کو علم ہے اور پھر آپ کا ارشاد ہے، واللہ کل ضرور چلوں گا۔

دوسرے دن اسی وقت وہ دفتر سے اٹھا اور میرے ساتھ چل پڑا۔

کوٹھی پر پہنچے، کچھ ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں اور پھر بغیر کسی تعارف کے میں نے عرض کیا۔ ڈاکٹر صاحب! آپ کے ارشاد کے مطابق یہ خوش الحان نوجوان حاضر ہے۔

یہ سن کر ان کی آنکھوں میں چمک سی آ گئی۔ انہوں نے بڑی پیار بھری نظروں سے نظامی کو دیکھا۔ یوں محسوس ہوا جیسے وہ دل ہی دل میں اسے دعائیں دے رہے ہیں۔ سراج نظامی نے بغیر کسی رسمی تمہید کے گانا شروع کیا، خود صاحبِ ذوق اور ڈاکٹر صاحب کا نبض شناس، فارسی، اردو، بھاشا، پنجابی، ہر طرح کی نظمیں پڑھتا چلا گیا۔ حسنِ اتفاق سے کوئی شخص باہر سے نہ آیا اور محفل بے خلل رہی۔ دو ایک مرتبہ علی بخش آیا اور اس نے چپکے سے حقے کو ٹٹولا لیکن ڈاکٹر صاحب کو خاموش اور بے نیاز پا کر لوٹ گیا۔ یہ صحبت دو ڈھائی گھنٹے تک رہی۔ اس اثنا میں ڈاکٹر صاحب ایک عالمِ کیف میں ڈوبے رہے، کبھی وہ بے ساختہ "واہ" کہتے اور کبھی ایک گہری آہ بھر لیتے۔

اُ، ہم ،غم معمہ! شگفتگی آ گئی تھی، رُوح کی تازہ بالیدگی، جیسے وہ، وہ کبھی بیمار ہی

نہیں تھے۔

ہمارے لیے یہ لمحات انتہائی مسرّت اور شادمانی کے تھے۔

اس واقعہ کے چند روز بعد مجھے امرتسر جانا پڑا۔ میرے دوست تاثیر کی سالگرہ تھی۔ تمام احباب شرکت کے لیے وہاں پہنچے تھے۔ دو دن اور دو راتیں وہاں بسر ہوئیں۔ تیسرے دن صبح کو ہم لوگ دو موٹر کاروں میں سوار ہو کر لاہور ریڈیو سٹیشن پہنچے۔ ابھی دفتر میں بیٹھنے نہ پائے تھے کہ سیّد نذیر نیازی آ کر مجھ سے ملے، کہنے لگے، ڈاکٹر صاحب دو دن سے آپ کو بہت یاد کر رہے ہیں۔ انہوں نے آپ کی طرف پیغام بھی بھیجا تھا، آپ گھر پر نہیں تھے۔ مَیں نے پوچھا، اُن کا کیا حال ہے؟

بولے، چند دنوں سے ان کی طبیعت کچھ زیادہ ہی علیل ہے۔

شیخ حسام الدین ہمارے ساتھ ہی امرتسر سے لاہور آئے تھے۔ کچھ عرصے سے سیاسی اختلافات کی بنا پر ڈاکٹر صاحب اور شیخ صاحب کے درمیان ملاقات کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا لیکن جب انہوں نے ڈاکٹر صاحب کی علالت کا حال سنا تو بے تاب ہو گئے۔ بھائی تاثیر، مَیں اور شیخ صاحب فی الفور کوٹھی پر پہنچے۔

ڈاکٹر حسب معمول حُقّہ پی رہے تھے لیکن اُن کے چہرے پر وہ شگفتگی نہ تھی جو اکثر آشنا صورتوں کے دیکھنے سے پیدا ہو جایا کرتی تھی۔ اُس دن وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی یوں محسوس ہوا جیسے اچانک چونک پڑے ہوں۔

مزاج پرسی کے بعد میں نے عرض کیا:

"قبلہ آپ نے مجھے یاد فرمایا، کیا ارشاد ہے؟

کچھ دیر تامّل کے بعد بولے، ہاں یاد آیا وہ نوجوان کہاں ہے؟

میں نے پوچھا۔ کون نوجوان؟

وہ جس نے مجھے نظمیں سنائی تھیں ..... وہ پھر آسکتا ہے ؟

مَیں نے کہا، کیوں نہیں، جب بھی آپ فرمائیں، حاضر ہو جائے گا۔

فرمایا، اُسے ضرور بلائیے اور جلد ہی بلائیے۔ مجھے اس کا گانا بہت پسند ہے۔

تاثیر صاحب جو نوجوان کا اشارہ سمجھ گئے تھے بولے :

کم بخت کی آواز میں کتنا سوز ہے، اور پھر وہ پڑھا لکھا آدمی بھی ہے۔

فرمانے لگے :

پڑھے لکھے تو خیر اور بھی ہیں، وہ اس طرح شعر پڑھتا ہے جیسے خود بھی محسوس کر رہا ہو، اُس کی آواز دل سے نکلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ پھر اُسے فارسی، اُردو، پنجابی سبھی نظمیں یاد ہیں۔

اُس روز عرشی کی جو پنجابی نظم اُس نے سنائی تھی، بہت خوب تھی میں عرشی کو محض مولوی سمجھتا رہا، یہ پتا نہ تھا کہ اس کے سینے میں بھی ایک دردمند دل ہے، اچھی نظم لکھی ہے۔

اب وہ آہستہ آہستہ اس نظم کے یہ مصرعے گنگنانے لگے :

اساں منجواں ہار پرونا، دُکھ تینوں نیوں دسنا

تیرے سامنے بیٹھ کے رونا، دُکھ تینوں نیوں دسنا

اس پر پنجابی شاعری پر گفتگو کا سلسلہ چلا، فرمانے لگے :

پنجابی ہماری مادری زبان ہے، اس میں جو بات پیدا ہو سکتی ہے وہ کسی اجنبی زبان میں ممکن نہیں۔ اس زبان کو جب کبھی بڑا شاعر ملا تو اُس نے شاہکار پیدا کیے۔ وارث شاہ کی ہیر، فضل شاہ کی سوہنی مہینوال اور ہاشم شاہ کے دوہڑوں سے چل کر بات خواجہ غلام فرید چاچڑاں والے کی شاعری تک پہنچی۔

ڈاکٹر صاحب بولے :

افسوس کہ خواجہ صاحب کی شاعری ایک خاص علاقے تک محدود ہو کر رہ گئی۔

اُن کا کلام ایک گہرے مطالعہ کا محتاج ہے۔ مجھے تو اس میں بین الاقوامی حیثیت و اہمیت کے عناصر نظر آتے ہیں۔

دفعتہً فرمانے لگے، ہاں تو مجھے یاد آیا:

کوڑا کرکٹ اور گندگی کے ڈھیر کے لیے فارسی میں کونسا لفظ ہے، سوچتا تھا، تم آؤ تو پوچھوں۔

میں نے عرض کیا، یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟

کہنے لگے، واقعی، آپ فارسی پڑھاتے ہیں نا، خیال تھا کوئی موزوں لفظ مل جائے گا۔

میں نے دو تین لفظ پیش کیے، فرمایا:

یہ پہلے سے میرے ذہن میں ہیں، مَیں کوئی زیادہ موزوں لفظ چاہتا ہوں۔ ایک ایسے دماغ کے لیے تشبیہہ کی ضرورت ہے جس کا ظاہر تو خضرائے دمن کی طرح عارضی طور پر شگفتہ نظر آتا ہے لیکن اس کے اندر گندگی بھری ہوتی ہے۔ ایک رباعی لکھنا چاہتا ہوں اس کے لیے لفظ کی تلاش ہے۔

پیشتر اس کے کہ ہم پوچھتے کہ وہ دماغ کونسا ہے، وہ خود بول اٹھے:

ہماری قوم کے اکثر اصحاب فکر کے دماغوں کی یہی کیفیت ہے اور بالخصوص...

وہ کچھ اور کہنا چاہتے تھے کہ اُن کے معالج ڈاکٹر یوسف تشریف لے آئے اور ابھی وہ معائنے میں مصروف ہی تھے کہ شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشی بھی آ گئے۔

دونوں نے باہم مشورہ کیا، ڈاکٹر صاحب سے استمزاج بھی کیا گیا۔ کچھ منسی مذاق کی باتیں بھی ہوئیں۔ چارہ گروں نے تسلیاں دیں اور کہا، حالت پہلے سے بہتر ہے۔ یہ کہہ کر وہ رخصت ہو گئے۔

ڈاکٹر صاحب یونانی علاج کا تذکرہ کرنے لگے اور کہا کہ جس قدر ان لوگوں کا اپنا ذاتی انداز اور اُن کا طریق علاج افسردہ کر دیتا ہے، اُسی قدر اُن کی بعض دوائیاں شگفتگی

اور انبساط کا موجب ہوتی ہیں۔ میں ہمیشہ سے ان کا قائل رہا ہوں لیکن اب کے تو یقین ہو گیا ہے کہ ان دوائیوں میں ایسے عناصر موجود ہیں کہ انسان جسمانی طور پر ٹھیک ہو نہ ہو، ذہنی طور پر صحت یاب ضرور ہو جاتا ہے۔ یہ کم بخت مرض کی تلخی کو بھی خوشگوار بنا دیتی ہیں۔ اتنے شدید مرض کے باوجود میرے زندہ رہنے کی شاید یہی وجہ ہے۔

اس پر وہ یک لخت خاموش ہو گئے۔ لمحہ بھر کی خاموشی کے بعد اُٹھ بیٹھے اور فرمانے لگے :

یہ لوگ کہتے تو ہیں مَیں تندرست ہو رہا ہوں لیکن مجھے اب بات ختم ہوتی نظر آتی ہے۔

یہ الفاظ انہوں نے کچھ ایسے غمناک لہجے میں کہے کہ ہم سب دم بخود رہ گئے۔

اُن کا دیرینہ خادم علی بخش دروازے پر کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

ایک اور صاحب وہاں بیٹھے تھے، بولے :

کیوں روتا ہے، کوئی فکر کی بات نہیں، اللہ سے فضل مانگو۔

ڈاکٹر صاحب پھر لیٹ گئے، آنکھیں بند کر لیں، فرمایا :

اسے رونے سے مت روکو، آخر پینتیس سال کا ساتھ ہے، جُدا ہوتے تکلیف ہوتی ہے۔

میں نے گھر پہنچتے ہی اس نوجوان کو ڈاکٹر صاحب کا پیغام دیا لیکن بعض مجبوریوں کے باعث وہ حاضر خدمت نہ ہو سکا۔

چند روز کے بعد ڈاکٹر صاحب دُنیا سے رخصت ہو گئے۔

اُن کے جنازے کے ساتھ ہزاروں کا مجمع تھا۔ دوست، عزیز، عقیدت مند سبھی شریک تھے۔ سب جنازے کو کندھا دینے کے لیے آگے کو بڑھتے تھے لیکن ہجوم سے بہت پیچھے ایک شخص تنہا سر جھکائے، آہستہ آہستہ قدم اٹھائے چلا جا رہا تھا۔ آہوں کے ساتھ کبھی کبھی اُس کے مُنہ سے بے ساختہ چیخ بھی نکل جاتی تھی۔ اس کے قریب چلنے والے لوگوں کی نظریں اچانک اُدھر کو اُٹھتیں اور پھر مایوسی میں لَوٹ آتیں۔

یہ وہی وعدہ شکن نوجوان سراج نظامی تھا۔

منظومِ خراجِ عقیدت

فارسی

اردو

پنجابی

اقبال (فارسی)

به بزم بیدلاں شمعِ حیات افروختی رفتی
وفا ناآشنایاں را وفا آموختی رفتی

نه ایں دُنیا پسند آمد نه آں دُنیا پسند آمد
نه آں اندوختی رفتی ، نه ایں اندوختی رفتی

نبوده سوءِ غیراں در خورِ طبعِ بلند تو
تو قلبِ خویش را با آتشِ خود سوختی رفتی

بیک حرفِ اثر آسوده کردی صد پریشاں را
بیک تارِ نظر، صد چاکِ داماں دوختی رفتی

به چشمِ کم نگاہاں ریختی نورِ بصیرت را
به قلبِ سرد روحاں سوزِ جاں افروختی رفتی

صوفی تبسم

اقبال (اُردو)

سُونی سُونی تھی پڑی ارضِ کہن برسوں سے
مضمحل سے تھے در و دشت و دمن برسوں سے

ایک سنّاٹے میں ڈوبی تھی فضائے گردوں
اِک روش پر تھا زمانے کا چلن برسوں سے

نہ کہیں گُل ہی مہکتا نہ چٹکتی تھی کلی!
ایسے ویران تھے ایوانِ چمن برسوں سے

دم بخود سی نظر آتی تھی حسیں آوازیں
سخت افسردہ تھی دُنیائے سخن برسوں سے

بزم بے سوز تھی، خاموش تھے نغماتِ ہُنر
بجھ چکا تھا شرر شوخیٔ فن برسوں سے

صوفی تبسّم

اقبال (اُردو)

"نعرۂ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شُد
حُسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شُد"

اُس کے آتے ہی اُمنگوں کی فضا جاگ اٹھی
آرزوؤں کے مچلنے کی ادا جاگ اٹھی
اُس کی آواز سے پھر زیست کا نغمہ اُبھرا
ہر رگِ ساز میں اک تازہ نوا جاگ اٹھی
وہ چلا رہ کہ کھُلیں رہروؤں کی آنکھیں
کارواں چونک پڑا، بانگ درا جاگ اُٹھی
ذہنِ انساں میں چمکنے لگا پیمانِ ازل
شوق بیدار ہوا، خوئے وفا جاگ اٹھی
پھر دمکنے لگا خورشید کا رُوئے تاباں
پھر سے سوئی ہوئی کرنوں کی ضیا جاگ اٹھی

صوفی تبسّم

شعرِ اقبالؒ

جہانِ فکر میں رازِ سخنوری کا نشاں
جمالِ دانش و حکمت کی یادگارِ جمیل
دیارِ فقر میں شانِ قلندری کا نشاں
جلالِ عشق و محبّت کا شاہکار جلیل
تُو سحر کاریٔ لوح و قلم کا آئینہ دار
تُو لفظ و معنی کا اِک ارتباطِ رنگا رنگ
تُو شعلہ گستری زیر و بم کا آئینہ دار
تُو حرف و صوت کا اِک امتزاجِ خوش آہنگ
نشاطِ بزم میں تیرا اثر سکوں پرور
طرب فزائیٔ خوابِ شگفتہ کی تعبیر
بساطِ رزم میں ترا رجز خروش آور
رموزِ کارکُشائی کا نسخۂ تفسیر
تُو ایک صاحبِ قلب و نظر کا دیدۂ تر
تُو ایک شاعرِ رنگیں نوا کا خُونِ جگر

تُربتِ اقبالؒ

مَیں وفورِ شوق سے تھا دشتِ پیمائے سُخن
آبلہ پائے تخیّل گوہر آرائے سُخن
ہر رگِ تن نغمہ زن تھی مثلِ تارِ سازِ درد
ہر سرِ مُو سے نکلتی تھی مرے آوازِ درد

لے رہی ہے چٹکیاں پہلو میں یوں یادِ وطن
دل میں جذباتِ وطن تھے لب پہ فریادِ وطن
کچھ نہ پُوچھو کیا ہی بالِ شوق و اُلفت سے اُڑا
طائرِ دل تُربتِ شاعر کی جانب لے اُڑا

خواب گاہِ باز پر نغمہ سرا ہونے لگا
بُلبُلِ باغِ سُخن سے ہمنوا ہونے لگی
یوں کہا اے آشنائے معنیِ اسرارِ علم
مبداءِ فیضانِ دانش مرجعِ انوارِ علم

تیرے نغموں سے کبھی معمور تھا باغِ وطن
شمعِ ہستی سے تری پُر نُور تھا باغِ وطن

اقبالؒ

عہدِ رفتہ کی صدیوں کے سائے تلے
جگمگاتی ہوئی عظمتیں سو گئیں
داستانِ کہن اِک فسانہ بنی
یاد کی رفعتیں سرنگوں ہوگئیں

تُو نے افسردہ راہوں کو چونکا دیا
تُو نے خاکستروں سے شرارے چُنے
زندگی قوم کی اِک کفِ خاک تھی
تُو نے اس خاک سے بھی ستارے چُنے

ان شراروں سے پھُوٹی نوائے سخن
ان شراروں سے گیتوں کے شعلے اُٹھے
ان ستاروں سے چمکی فضائے سُخن
ان ستاروں سے پُرنور نغمے بنے

اقبالؒ

جانے کیڑیاں کھونجاں وچوں چمکاں لے کے آیا سیں
راہواں دے ذریاں نوں چک کے تاریاں سنگ ملایا توں
جانے کتھوں اُس اُمید دے حوصلے چک لیایا سیں
صدیاں دے بے وسیاں رسدھراں وِچ وسایا توں

اقبال (پنجابی)

صبح نوں اُٹھ کے سجدیاں دے وچ جھک جھک دعاواں کردا رہیا

شام شفق دی سُرخی اُتّے خون جگر دا ملیا توں

دن نوں مِٹھیاں گلّاں کر کے دل دے زخم نوں سلیا توں

رات دے گھُپ ہنیرے دے وچ لُک لُک آہواں بھردا رہیا

صوفی تبسّم

اقبال

(پنجابی)

ترا پیام عمل دا سی ، اسیں بے عملی وِچ آ کھُبے
ہور ای طور طریقے پھڑ لے ، ہور ای پاسے ڈھل گئے

خودی دے درس نوں چھڈ دِتا تے خود غرضی وچ جا ڈُبے
اپنیاں گلّاں کر دے کر دے تیریاں گلّاں بھُل گئے

فیر وی ساڈے دلاں دے اندر جاگ رہی اے یاد تری
فیر وی ساڈے کنّاں وچ گونج دی اے فریاد تری

صوفی تبسّم

اقبال کے منظوم تراجم

۱۔ اُردو

۲۔ پنجابی

ترجمہ: اقبالؒ

اگرچہ زیبِ سرش افسر و کلاہے نیست

اگرچہ سر پہ کوئی افسر و کلاہ نہیں
گدائے کوچہ ترا کم ز بادشاہ نہیں

جوان سوئے ہوئے اور مُردہ دل ہیں بزرگ
کسی کے سینے میں اِک آہِ صبحگاہ نہیں

اسی بہانے سے دشتِ طلب کو چھوڑ نہ جا!
یہ دَور وُہ ہے کوئی آشنائے راہ نہیں

گناہ لکھیں تو کیا اپنا کاتبانِ عمل؟
ترے جہاں سے میسّر جُز اِک نگاہ نہیں

ابھی سے وقت کو اپنی گرفت میں لے لے
یہاں حساب شب و روز و سال و ماہ نہیں

اُٹھو کہ دامنِ اقبال تھام لیں چل کر
وہاں پہ دلق فروشیٔ خانقاہ نہیں

ترجمۂ اقبالؒ اُردو

بہ فغاں نہ لب کشودم کہ فغاں اثر ندارد

کروں کیا فغاں کہ اس میں تو ذرا اثر نہیں ہے
مرے غم کی تاب لائے، یہاں وہ جگر نہیں ہے

ہو حرم کہ بُتکدہ ہو، وہی بات دوستی کی
میرے تیرے رازِ دل سے کوئی باخبر نہیں ہے

تُو نظر کی رہ سے گزرا تو اُتر گیا دِلوں میں
مگر اس طرح سے گزرا کہ ہمیں خبر نہیں ہے

مرے دل کے اس نگیں کو نہ نگیں شناس سمجھے
تُو ہی رکھ لے اس کو یاں تُو کوئی بانظر نہیں ہے

یہ خرد فروز ساغر جو فرنگ نے دیا ہے
ہے تو آفتاب لیکن اثرِ سحر نہیں ہے

ترجمہ اقبالؒ

"خاکیم و تندسیرِ مثالِ ستارہ ایم"

یُوں خاک ہیں، پہ تُند مثالِ ستارہ ہیں
بحرِ فضا میں محوِ تلاشِ کنارہ ہیں

اِک شعلۂ حیات سے ہے اپنی ہست و نیست
ذوقِ خودی میں مثلِ شررِ پارہ پارہ ہیں

بادِ سحر سے لرزاں کلی سے ہیں عشق میں
اور زندگی میں ایک گراں سنگ خارہ ہیں

خود پیدا کی ہے صورتِ نرگس چمن میں آنکھ
رُخ سے نقاب اُلٹ! کہ سراپا نظارہ ہیں

ترجمہ اقبالؒ

"مثلِ آئینہ مشو محوِ جمالِ دگراں"

مثلِ آئینہ نہ ہو محوِ جمال اوروں کا
دیدہ و دِل میں نہ آنے دے خیال اوروں کا

اپنے پَر کھول کہ ہے تیرے لئے باعثِ ننگ
تری پرواز میں زورِ پَر و بال اوروں کا

مَیں ہُوں آزاد و غیور اتنا کہ مر جاؤں گا
چکھ جو لوں یونہی کہیں جام زلال اوروں کا

جاں سے نزدیک ہے تُو اور نگہ سے پنہاں
تری فرقت ہو تو کیا شئے ہے وصال اوروں کا

ترجمۂ اقبالؒ

"گریۂ ما بے اثر نالۂ ما نارسا ست"

گریہ ہے سب بے اثر، نالہ ہے سب نارسا
ماحصل اس سوز کا، اِک دلِ خونیں نوا

مطرب میخانہ رات، یُوں ہُوا نغمہ سرا
بادہ چشتی ہے خطا، بادہ کشی ہے دوا

زندگیٔ رہرواں ہے یہ تگ و تاز ہی
قافلۂ موج کا جادہ و منزل ہی کیا؟

شعلہ صفت آگری مجھ خس و خاشاک پر
مُرشد رُومی کی بات، منزل ما کبریا

ترجمۂ اقبالؒ

در جہانِ دل ما دَورِ قمر پیدا نیست

ہے یہ جہانِ دل یہاں، دَورِ قمر کہیں نہیں
یُوں تو ہے انقلاب، پر شام و سحر کہیں نہیں

حیف وہ قافلہ کہ جو ہمتِ پست کے سبب
چل پڑا ایسی رَہ جہاں خوف و خطر کہیں نہیں

جا کے محیطِ عشق کی موجِ عمیق سے لپٹ
عقل تو جوئے تنگ ہے اس میں گہر کہیں نہیں

تیرے مرے خیال کا مقصدِ کشمکش ہے جو
آنکھ میں جاگزیں ہے وُہ، مثلِ نظر کہیں نہیں

ترجمہ اقبالؒ

بتانِ تازہ تراشیدۂ دریغ از تو

ہر گھڑی اِک نیا بُت تُو نے تراشا، افسوس
اپنے دِل کو نہ کبھی تُو نے کریدا، افسوس

اتنا پگلا دیا افرنگ کی گرمی نے تجھے
اپنی آنکھوں سے تو خود آپ ہی ٹپکا افسوس

اس گلی میں کہ جہاں خاک کی قیمت ہو بلند
نیم غمزے کے برابر بھی نہ ٹھہرا افسوس!

مانا، تُو نے کیا ہر دَرسِ خِرد کو ازبر
شوق کی بات کا اِک حرف نہ سیکھا افسوس

دہر میں گھوما، کیا تُو نے حرم کا بھی طواف
اپنے گرد ایک بھی چکّر نہ لگایا افسوس!

منظوم تراجم

کل اِک بُلبُل باغ دے اندر مالی نوُں سمجھاوے

ایس مٹی وِچ غم ای پھلدا کسے ہور نوں راس نہ آوے

چنگل وِچ جو کنڈا اُگے پہنچے توڑ بڑھاپے

پُھل جد آوے جوبن اُتے چان چک مرجائے

اقبال

جنّت دی دُنیا

ایہہ جنّت اے، ایتھے کوئی وَل فریب جہان دا نئیں
ایس زمین دے سر دے اُتّے چکر کسے اسمان دا نئیں

ایدا یوسف واقف ناہیں قید خانے دیاں راہاں توں
ایہدی زلیخاں دا دل خالی فریاداں تے آہاں توں

ایتھے ابراہیم کدی وی اگاں دے نال لڑ دا نئیں
ایتھے مُوسیٰ غش نہ کھاوے ایتھے طور دی سڑ دا نئیں

ایتھے بیڑیاں دے ڈُبّن دا کوئی دی امکان نئیں
ایتھے گھُمن گھیر نہ کوئی، ایتھے کوئی طوفان نئیں

ایتھوں دے واسی نئیں روندے دُکھڑا بہتے تھوڑے دا
ایتھے وصل دے نال نہ چھووے درد فراق وچھوڑے دا

ایتھے عقل نہ ٹھوکر کھاوے دوش کیہہ دانشمنداں دا
رستے دے وَل پیچاں باہجوں مزا نہ آوے پنڈھاں دا

اوس دُنیا توں نٹھ اوتے سجناں اوس دُنیا وچ جان نئیں
جس دُنیا وِچ اللہ اے جس دُنیا وِچ شیطان نئیں

(اقبال)

مومن

اوہدے ہتھ وِچ خُدائی دِیاں طاقتاں تے زور
اوہدے زور وِچ مشکلاں تے قسمتاں دی جان

خاکی پُتلا تے نُوریاں حضوریاں دا رُوپ
بندہ ہو کے وی ساری اوہدی مولا والی شان

اوہدی نظراں وِچ کُجھ نہ اسماں نہ زمین
اوہنوں کوئی وی نہ جچے ایہہ جہان اوہ جہان

اوہدے نرم نرم بولاں وِچ سوہنیاں دی چھب
اوہدے تیز تیز قدماں وِچ غازیاں دا مان

ہووے صلح بھانویں جنگ اوہدا اکو جیہا رنگ
اوہنوں اپنا یقین اوہنوں اپنا ایمان

اوہدے قول دی نرول اوہدے فعل دی نرول
اوہدے مِٹھے مِٹھے بول اوہدی مٹھری زبان

سب حقیقتاں دی جان ایس بندے دا یقین
باقی دُنیا تمام خالی وہم تے گماں

(اقبال)

ترجمہ بوئے گُل

پنجابی

اِک حور فردوس دے باغ اندر بڑی کلپدی کلپدی کہن لگی
کیہہ ہوندا اے اسمان دے اُس پاسے ایس رازدی ساہنوں نہ خبر کوئی

میری سمجھ دے وچ نہیں آوندا اے صبح وشام کیہہ نیں دن رات کیہہ نیں
ایدھر اِک جمیا اودھر اِک موئیا، ایہہ کیہہ سلسلہ اے ایہہ کیہہ گل ہوئی

رنگ دی لہر بن کے پھٹی شاخ وچوں اِنج آئی ایس فانی جہان دے وچ
کھلی کلی وانگوں ہنسی، پھُل بن گئی پتّیاں جھڑ گئیاں اِکو آن دے وچ

نس کے آئی بہشت توں، ختم ہوئی ایس نسنے دا مزہ چکھ لینا
اِک آہ رہ گئی یادگار اوہدی، اساں ناں اوہدا خوشبو رکھ لیا

ونڈ

ترجمہ

ایس لوہے دے کرخانے دے شور شرابے میرے
ایہہ گرجا تے ایس گرجے دا بھجن سُہانا تیرا

ایہہ کھیتی جس کھیتی اُتّے مالیہ لگے میری
جنّت دے باغیچے تیرے، سدرہ طُوبیٰ تیرا

ایہہ شراب ایہہ کوڑا پانی، ایہہ سَر دَردی میری
کوثر والی پاک شراب دا سارا نشّہ تیرا

ایہہ مُرغابی، ایہہ بٹیرے، ایہہ کبوتر میرے
عنقا دے شہپر نے تیرے، سایہ ہما دا تیرا

اے زمین تے ایس زمین وچہ جو شے ہے اوہ میری
خاک توں لے کر عرش مُعلّیٰ تیکر سارا تیرا

پتنگا

بھڑکی شوق والی اگ ڈاہڈا رنگ لاگئی
اِک نکّے جیہے ذرّے وِچ جان پاگئی

اوہدے دِل نوں جگایا
اوہ پتنگا بن آیا
سارا جگ چمکایا

اِک ٹُٹّی ہوئی شعاع وَل پیچ کھا گئی
ایس وَل وچوں زندگی دا بھیت پاگئی

اِک حقیر جیہی لکیر
بن گئی اکسیر
مارے نیناں والے تیر

اِک پتنگا اُڈدا اُڈدا شمع نال چھُو گیا
ایسا آپ نوں جلایا سویو رُوپ ہوگیا

گئی خودی والی بُو
کوئی مَیں رہیا نہ توُ
کرے ہُو ہُو ہُو

یاں کوئی چھوٹا جیہا تارا آسمانوں آ گیا
چند پِچھے پِچھے لگا ایدا کھوج پا گیا

جُوں جُوں قدم اُٹھایا
ایدا من للچایا
دُنیا دیکھنے نوں آیا

یاں ایہہ نمّاں نمّاں چند جدا توڑ کوئی ناں
نُور سورج کولوں منگنے دی توڑ کوئی ناں

کدی گھٹے نہ گھٹاوے
اِکو چھب دکھلاوے
جدھر چاہوے گھم آوے

ایس نکّے جیہے کیڑے دی اُڑان ویکھ لو
ایس اُڑان وِچ نویں ایدی شان ویکھ لو

کدی نیڑے کدی دُور
ایہہ پردہ ایہہ ظہُور
نرا غیب تے حضُور

کالیاں راتاں نوں مشالاں بال بال نسنا ایں
رستہ بُھلے ہوئے پنچھیاں نوں راہ دسنا ایں

کیہڑی اگ بھڑکایا
بھانبھڑ سینے وِچ لایا
پل چین نہیں ادہ پایا

تیرے وانگ ایسے مٹّی ساڈا اُوپ ڈھالیا اے
ایسے خاک وِچوں جمّے ایسے خاک پا لیا اے

کیہہ میل کیہہ جُدائی
دِتی دوہاں دی دُہائی
ڈھوئی فیر وی نئیں پائی

اِک گل تینوں آکھاں نری تجربے دی دھار
گل سچّی تے نرول گل ڈوہنگی نہ دار

جیہڑی بھُل جائیں راہ
اوہدا کھائیں نہ وساہ
لائی جائیں ایہہ واہ

(اقبال)

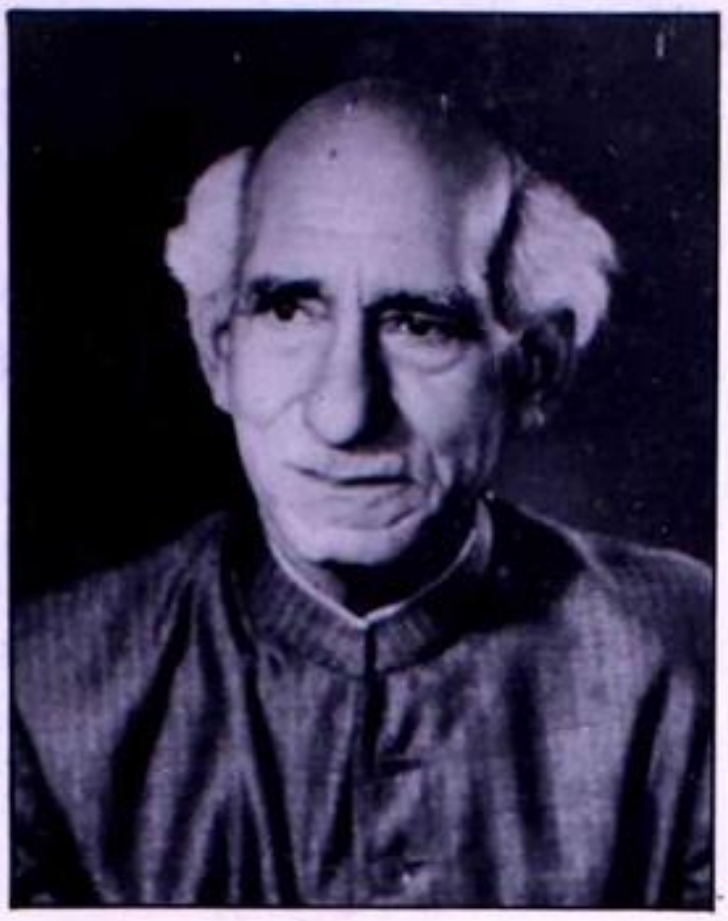

صُوفی غلام مُصطفےٰ تبسّم المعروف صُوفی تبسّم اُستادانِ فن میں سے تھے۔ آپ اقبال شناسی میں اپنا ایک علیحدہ مقام رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے اُمّتِ مُسلمہ کو علّامہ اقبالؒ کے افکار سے رُوشناس کرانے کے لیے عُمرِ عزیز کو وقف کیے رکھّا۔

زیرِ نظر کتاب صوفی صاحب کی آخری تصنیف ہے۔ اِس میں علّامہ اقبالؒ اور چند اہم شخصیات کی ملاقاتوں کو دلچسپ پیرائے میں صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا گیا ہے۔ ہمیں اُمّید ہے کہ یہ کتاب علّامہؒ کے قدر دانوں، محققین اور صُوفی تبسّم کے مدّاحوں کے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوگی۔

خالد شریف